زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ
اشاعت کا ۳۳واں سال

شگوفہ

جلد ۳۴
شمارہ ٦

حیدرآباد
جون ۲۰۰۱ء

ایک شمارہ مشتاق احمد یوسفی کے نام

قیمت فی پرچہ ۱۵ روپے زرِ سالانہ : ۱٦۰ روپئے بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ : ۳۱ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد 500001

فون : (آفس) 4745716 (رہائش) 4576064
شگوفہ انٹرنٹ پر : http://www.shugoofa.cjb.net
ای میل : shugoofa @ india.com

Admission-2001/02

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

(پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت ۱۹۹۸ء میں قائم مرکزی یونیورسٹی)

نظامت فاصلاتی تعلیم

اعلان داخلہ ۔ 2002-2001

اُردو ذریعہ تعلیم اور فاصلاتی طریقے سے درج ذیل کورسوں میں داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں:

۱۔ بی اے/بی ایس سی/بی کام سال اول میں داخلہ بذریعہ اہلیتی امتحان۔

رسمی تعلیمی قابلیت نہ رکھنے والے امیدواروں کو بی اے/بی کام/بی ایس سی میں داخلے کے لئے اہلیتی امتحان میں کامیابی حاصل کرنی ہوگی۔ یہ امتحان 19 اگست 2001 بروز اتوار کو یونیورسٹی کے 47 اسٹڈی سنٹروں اور بعض دیگر مقامات پر منعقد ہوگا۔ امیدواروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ یکم جنوری 2002 کو اپنی عمر کے 18 سال مکمل کرلیں۔ اہلیتی امتحان کے لئے خانہ پری کی ہوئی درخواست مع رجسٹریشن فیس 100 روپے وصول ہونے کی آخری تاریخ 21 جولائی 2001 ہے۔

2۔ بی اے/بی ایس سی/بی کام میں راست داخلہ۔ 3۔ چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے کمپیوٹنگ۔

کورس نمبر 2 اور 3 کے لیے ایسے امیدوار درخواست دینے کے اہل ہیں جنھوں نے کسی مسلمہ بورڈ/ادارے/یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ یا 10+2 یا ان کے مساوی امتحان میں کسی بھی ذریعہ تعلیم سے کامیابی حاصل کی ہو۔ انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دیے گئے کورسوں کی فہرست پراسپکٹس میں شائع کی گئی ہے۔ خانہ پری کی ہوئی درخواست وصول ہونے کی آخری تاریخ 15 نومبر 2001 ہے۔

نوٹ:۔ بی ایس سی پروگرام صرف حیدرآباد' نظام آباد' بنگلور' گلبرگہ' ناندیڑ اور ممبئی میں اور کمپیوٹنگ پروگرام صرف حیدرآباد' کرنول' بنگلور' بھیونڈی اور ممبئی میں

چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام ہوائے 4۔ اہلیت اُردو بذریعہ انگریزی 5۔ اہلیت اُردو بذریعہ ہندی 6۔ غذا اور تغذیہ

کورس نمبر 4' 5 اور 6 میں داخلہ کے لئے کسی رسمی تعلیمی قابلیت یا اہلیتی امتحان میں کامیابی کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ امیدواروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ یکم جنوری 2002 کو اپنی عمر کے 18 سال مکمل کرلیں۔ خانہ پری کی ہوئی درخواست وصول ہونے کی آخری تاریخ 15 نومبر 2001 ہے۔

یونیورسٹی اور اس کے پروگراموں سے متعلق تفصیلی معلومات پراسپکٹس میں فراہم کی گئی ہیں۔ پراسپکٹس مع درخواست فارم شخصی طور پر یا بذریعہ ڈاک نیچے دیئے گئے پتے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ حسب ذیل ریجنل اور اسٹڈی سنٹروں پر پراسپکٹس مع داخلہ فارم نقد رقم ادا کرنے پر دستیاب ہے۔

1۔ دہلی ریجنل سنٹر: D-277' نیو مارکٹ اپار ٹمنٹس' ذاکر نگر' اوکھلا گاؤں' جامعہ نگر' نئی دہلی 025 110 **2۔ پٹنہ ریجنل سنٹر:** قیت نفیس حیدر' علی نگر' انیس آباد' پٹنہ 002 800 (بہار)

3۔ بنگلور ریجنل سنٹر: الامین آرٹس سائنس اینڈ کامرس کالج' ہسور روڈ' نزد لال باغ گیٹ' بنگلور۔ 027 560 (کرناٹک)

اسٹڈی سنٹر: آندھراپردیش:☆گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول' سیکنڈ لانسر' گولکنڈہ' حیدرآباد 008 500 ☆بی جی کالج' سرودھ نیل روڈ' سکندرآباد 003 500 ☆پرنس شبکار کالج فار ویمن' پرانی حویلی' حیدرآباد 002 500 ☆ممتاز کالج' ملک پیٹ' حیدرآباد 036 500 ☆یونیورسٹی آرٹس اینڈ سائنس کالج' صوبیداری' ہنمکنڈہ' ورنگل 010 506 ☆گولڈن جوبلی ہائی اسکول' قلعہ روڈ' نظام آباد 001 503 ☆المدینہ کالج آف ایجوکیشن' سالم نگر' محبوب نگر 001 509 ☆عثمانیہ کالج' کرنول 001 518 ☆عثمانیہ ڈگری کالج' رائیچورم' پرودا تور 360 516 (ضلع کڑپہ) ☆آندھرا اسلم کالج' بنور روڈ' نلگنڈہ 003 522 ☆بشریٰ اسلامیہ اسکول' بہادر یار جنگ روڈ' منیم چیلا' نلگنڈہ 001 508 ☆کریسنٹ اسکول' نیو کرم پورہ' اسٹریٹ' کریم نگر 001 505 ☆سنی جرس انگلش ر اُردو میڈیم اسکول' اشوک روڈ' عادل آباد 001 504 ☆لٹل ایبلک اسکول' نرائن کھیڑ 286 502' ضلع میدک۔۔۔ کرناٹک: ☆شاہین اردو ہائی اسکول' شاہین ایجوکیشنل سنٹر گاواں چوک' بیدر 401 581 ☆بی بی رضا ڈگری کالج فار ویمن' روضہ بزرگ' گلبرگہ 104 585 ☆انجمن انجینئرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ' گفت گری' ہبلی 020 580 ☆الحمود کمپوزٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج' رام منوہر لوہیا نگر' شموگہ 202 577 ☆گورنمنٹ جونیئر کالج فار بوائز' کولار 583231۔۔۔ مہاراشٹر: ☆مدینۃ العلوم ہائیر سکنڈری اسکول' مجھیون رام روڈ' ناندیڑ 604 431 ☆مولانا آزاد ایجوکیشنل سوسائٹی' روضہ باغ' پوسٹ بکس 27 اورنگ آباد 001 431 ☆انجمن اسلام کالج' ڈی این روڈ' چھترپتی شیواجی ٹرمنس' ممبئی 001 400 ☆الامین سکنڈری اینڈ ہائیر سکنڈری اسکول' ذوگیر' ضلع لاتور 517 413 ☆مرٹھواڑہ انسٹی ٹیوٹ آف اسٹڈی اینڈ ریسرچ' قادر بلٹ پلاٹ' نزد مسجد' پربھنی 431401 ☆صمدیہ ہائی اسکول' 349' مومن نگر' کیمری' بھیونڈی 302 421 ☆انجمن خیر البشر' بے سنگھ پور شیرول' کولہاپور 101 416 ☆دکن مسلم ایجوکیشن اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ' کے بی ہدایت اللہ روڈ' نتھو مودی خانہ' پونے 101 411۔۔۔ اترپردیش: ☆شبلی نیشنل کالج' اعظم گڑھ سٹی' اعظم گڑھ 001 276 ☆شمسی گرلز ہائیر سکنڈری اسکول' دو مہلا روڈ' رامپور 901 244 ☆اے۔ آئی۔ بی انٹر کالج' بھگن پور' فیض آباد 188 224 ☆جنت نشان اُردو کالج' پیر غائب' محو کھران' مراد آباد 001 244 ☆فیض عام کالج' میرٹھ ☆ڈاکٹر اقبال لائبریری' بانس منڈی' کانپور 001 208 ☆اسلامیہ گرلس انٹر کالج' سول لائنس' بریلی 001 243 ☆امیر الدولہ اسلامیہ ڈگری کالج' لکھنؤ۔۔۔ دہلی ☆شفیق میموریل اسکول' باڑہ ہندو راؤ' دہلی 006 110 ☆شعبہ اُردو' جامعہ ملیہ اسلامیہ' نئی دہلی 025 110۔۔۔ مدھیہ پردیش: ☆اُردو تعلیمی مجلس اسکول' احسن منزل' عید گاہ روڈ' بلاسپور 001 495 ☆صفیہ سائنس کالج' بھوپال 001 462۔۔۔ راجستھان: ☆مولانا ابوالکلام آزاد مسلم ہائیر سکنڈری اسکول' جودھپور 342009 ☆انسٹی ٹیوٹ فار ماڈرن ایجوکیشن اینڈ ریسرچ' آزاد نگر' خان پورہ' اجمیر 001 305۔۔۔ مغربی بنگال: ☆مسلم انسٹی ٹیوٹ' ۲۱' اے' حاجی محمد محسن اسکوائر' کلکتہ 016 700۔۔۔ تمل ناڈو ☆اسلامیہ کالج' نیو ٹاؤن' وانم باڑی' ویلور ڈسٹرکٹ' 635752۔۔۔ کیرلا ☆مرکز ثقافۃ السنیۃ الاسلامیہ' مرکز کمپلکس' آئی جی روڈ' کالی کٹ 004 673۔۔۔ جموں و کشمیر: ☆شعبہ اُردو' جموں یونیورسٹی' جموں۔

بی اے/بی ایس سی/بی کام کورسوں کے لئے پراسپکٹس مع درخواست فارم کی قیمت شخصی طور پر حاصل کرنے کی صورت میں 35 روپے اور بذریعہ ڈاک 40 روپے ہے۔ کسی بھی سرٹیفکیٹ کورس کے لئے پراسپکٹس مع درخواست فارم کی قیمت نقد ادا کرنے پر 10 روپے اور بذریعہ ڈاک 15 روپے ہے۔ بذریعہ ڈاک پراسپکٹس منگوانے کے لئے مطلوبہ رقم کا بینک ڈرافٹ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے نام جو حیدرآباد میں قابل ادا ہو' صرف نیچے دیے گئے پتے پر ہی ارسال کریں۔

ڈائرکٹر' ڈسٹنس ایجوکیشن' مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی' ڈیلکس کالونی' ٹولی چوکی' حیدرآباد 008 500

پروفیسر محمد سلیمان صدیقی' رجسٹرار اور ڈائرکٹر (انچارج) ڈسٹنس ایجوکیشن



اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

ایک شمارہ ---- مشتاق احمد یوسفی کے نام

مشتاق احمد یوسفی ترتیب: طارق حبیب

خود نوشت سوانحی خاکہ

ادیب کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ تو اپنی تحریر میں کہہ چکا ہوتا ہے اگر اس میں کوئی تشنگی ہے تو یہ اس کی تحریر کی اور اس کے ادیب ہونے کی تشنگی ہے۔ اس کی ضرورت بالکل نہیں ہونی چاہئے کہ وہ زبانی بھی کہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے۔ چناں چہ اپنے بارے میں اور اپنے فن کے بارے میں جو بھی چیز میں نے کہنے کے لائق سمجھی وہ تحریر میں آ گئی۔ عادم آدمی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی زندگی میں صرف تین موقعے ایسے آتے ہیں جب وہ تناسب کی نگاہوں کا مرکز ہوتا ہے۔ عقیقہ، نکاح اور تدفین۔ یہ سرگزشت ایک عام آدمی کی کہانی ہے جس پر بحمد للہ کسی بڑے آدمی کی پرچھائیں تک نہیں پڑی۔۔۔۔ ایک ایسے آدمی کے شب و روز کا احوال جو ہیرو تو کجا Anti-Hero ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتا۔ عام آدمی تو بے چارہ اتنی بھی سکت اور استطاعت نہیں رکھتا کہ اپنی زندگی کو مردم آزاری کے تین مسلمہ ادوار میں تقسیم کرسکے۔ یعنی جوانی میں فضیحت، ڈھلتی عمر میں نصیحت اور بڑھاپے میں وصیت۔ یہ طغیانِ شباب، لاف ہائے شاد کامی، معاصرانہ چشمکوں اور سیاست کی شوراشوری کی داستان نہیں، نہ کسی کی مہم جوئی اور کشور کشائی کا "ساگا" ہے۔ بایں ہمہ میں خود کو سکندر اعظم سے زیادہ خوش نصیب و کامران سمجھتا ہوں اس لیے کہ میں زندہ ہوں اور میری ایک سانس کی بادشاہت ابھی باقی ہے۔ غالب نے خود کو اس بنا پر آدھا مسلمان کہا تھا کہ شراب پیتا ہوں، سود نہیں کھاتا۔ فقیر سود کھاتا ہے، حرام شے نہیں پیتا کہ وہ وسیلہ معاش نہیں۔ حضرت موسیٰ کی امت نے تو سونے کے بچھڑے کی صرف پرستش ہی کی تھی ہم تو اس سے افزائش نسل کا کام بھی لینے لگے ہیں۔ سود پر روپیہ چلانا انسان کا دوسرا قدیم ترین پیشہ ہے۔ اس کے بارے میں کم از کم اردو میں ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا۔ پہلے قدیم ترین پیشے کا حق تو مرزا ہادی رسوا نے امراؤ جان ادا میں بعد ازاں سعادت حسن منٹو نے بہ کمال حسن و خوبی و خوباں ادا کر دیا۔

افسوس میرے یہاں سوانح کا اتنا فقدان ہے کہ تادمِ تحریر، زندگی کا سب سے اہم واقعہ میری پیدائش ہے (بچپن کا سب سے قابلِ ذکر واقعہ یہ تھا کہ بڑا ہوگیا) اور غالباً آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے کہ اس پر میں کوئی تین ایکٹ کا سنسنی خیز ڈراما نہیں لکھ سکتا۔ یہ ایک نو آموز بینکر کی آشفتہ بیانی ہے، کسی مقتول کا بیانِ نزعی نہیں جس کے اختتام پر اسے مرنے کی اجازت اور ملزم کو پھانسی دے دی جائے گی۔ آپ بیتی میں ایک مصیبت یہ ہے کہ آدمی اپنی بڑائی آپ کرے تو خود ستائی کہلائے اور ازراہ کسرِ نفسی یا جھوٹ موٹ اپنی برائی خود کرنے بیٹھ جائے تو یہ احتمال کہ لوگ جھٹ یقین کرلیں گے۔ کب اور کہاں پیدا ہوئے۔ یکم محرم کو، ستوانسا، ٹونک (راجستھان) میں، جہاں کے خربوزے اور چکوباز مشہور ہیں۔ آبائی مسکن جے پور۔ تعلیم جے پور، آگرے اور علی گڑھ میں ہوئی اور عمر عزیز کا بیشتر حصہ کراچی میں گزرا۔

اس صدی کی تیسری دہائی میں ایک خاتون نے جو اردو میں معمولی شدبد رکھتی تھیں اس زمانے کا مقبول ناول "شوکت آرا بیگم" پڑھا جس کی ہیروئن کا نام شوکت آرا اور معاون کردار کا نام فردوس تھا۔ ان کے جب بیٹیاں ہوئیں تو دونوں کے یہی نام رکھے گئے۔ ایک کردار کا نام ادریس اور دوسرے خدائی خوار کا انجمن تھا۔ یہ دونوں انھوں نے اپنے چھوٹے بیٹے کو بہ طور نام اور عرفیت بخش دیے۔ بچے کل چار دست یاب تھے جب کہ ناول میں ہیرو کو چھوڑ کر، ابھی ایک اور اہم کردار پیارے میاں نامی دلہن باقی رہ گیا تھا۔ چناں چہ ان دونوں ناموں، دوہرے رول کا بوجھ بڑے بیٹے ہی کو اٹھانا پڑا جس کا نام ہیرو کے نام پر مشتاق احمد رکھا گیا تھا۔ یہ سادہ لوح خاتون میری ماں تھی۔ بحمد اللہ ناول کی پوری کاسٹ، بہ استثنائے شوکت آرا، جس کا طفولیت ہی میں انتقال ہوگیا تھا، زندہ سلامت ہے۔ والدہ کی بڑی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں اور

عرب جاکر بدوؤں کا مفت علاج کروں۔ اس لیے کہ ناول کے ہیرو نے یہی کیا تھا۔ مولا کا بڑا کرم ہے کہ ڈاکٹر نہ بن سکا ورنہ اتنی خراب صحت رکھنے والے ڈاکٹر کے پاس کون پھٹکتا ... البتہ ادھر دو سال سے مجھے بھی سعودی عرب، بحرین، قطر، عمان اور عرب امارات کی خاک نہیں، تیل چھاننے اور شیوخ کی خدمت کی سعادت نصیب ہوتی رہی ہے۔ ہم اندرون سانگانیری گیٹ جے پور کے رہنے والے تھے۔ پرسٹلی نے کہیں لکھا ہے کہ جے پور سے زیادہ صاف سڑکیں میں نے دنیا میں کہیں نہیں دیکھیں وجہ یہ کہ گوبر اور لید زمین پر گرنے سے پہلے ہی اچھوت عورتیں کیچ لے لیتی ہیں۔ اردو سیکھی مارواڑ میں جہاں ہم پیدا ہوئے ... اور ... مادری زبان نہیں ہے۔ حالانکہ اہلیہ اہل زبان ہیں۔ یوں تو میں بھی ٹھیٹ اہل زبان ہوں۔ بشرطیکہ زبان سے مراد مارواڑی زبان ہو۔ ہر لفظ کے آگے پیچھے دو چشمی "ھ" لگاکر بولیں تو شاید لہجے میں وہ دھڑ دھڑاہٹ اور ہمہ ہمہ پیدا ہو جو راجستھانی بولی کا ٹھاٹھ اور سنگھار ہے۔ مجھے قومی زبان اردو سیکھنے کے لیے سخت محنت کرنی پڑی۔ جے پور کی مشہور چیزیں ... سانڈ، کھانڈ، بھانڈ اور رانڈ ہیں۔ سلیم شاہی جوتیاں اور چیزیں ... صاحب! راجستھان بھی خوب تھا ... کیا کیا سوغاتیں ... تھیں۔ اور یہ بھی خوب رہی کہ مارواڑیوں کو جس چیز پر بھی پیار آتا ہے اس کے نام میں ٹھ، ڈ اور ڑ لگادیتے ہیں ... راجستھان میں رانڈ سے مراد خوب صورت عورت ہوتی ہے۔ بھی خوب صورت نورٌ علیٰ نور بلکہ حورٌ علیٰ حور ہوتی ہیں ... صاحب راجستھان کے تین طرفہ تحفوں کے تو ہم قائل اور گھائل ہیں۔ میرا بائی، مہدی حسن اور ریشما۔ تیسری جماعت تک ٹونک (راجستھان) میں خود پر تعلیمی تجربے کروائے۔ دودھ کے دانت ٹوٹنے سے پہلے ہی خاصے دبیز شیشے کی عینک لگانے لگے تھے۔ پانچویں جماعت میں قدم رکھنے سے پہلے ہماری عینک کا نمبر، ہوگیا۔ بچپن ہی سے صحت خراب اور صحبت اچھی رہی ہے۔ یہاں ایک ادبی بدعت اور بدمذاقی کی وضاحت اور معذرت ضروری سمجھتا ہوں کہ عاجز نے باقاعدہ فارسی صرف چار دن چوتھی جماعت میں پڑھی تھی اور "آمد نامہ" کی گردان سے اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ ڈراپنگ لے لی۔ ہرچند کہ اس میں گردان نہیں تھی لیکن مقامات آہ و فغاں کہیں زیادہ نکلے۔ تین کرم فرما ایسے ہیں جو جانتے ہیں کہ میں فارسی سے نابلد ہوں۔ یہ تینوں درویش بے ریا و ریش برادرم مقصود الہیٰ شیخ (مصنف درد دل کشا اور سلسلہ روز و شب)۔ دوسرے کرم فرما ہیں ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب اور تیسرے ہیں حبیب لبیب و صاحب طرز ادیب محبی مختار مسعود جو عاجز کے وسیع و عمیق علمی خلا کو پر کرنے میں ربع صدی سے جٹے ہوئے ہیں۔ خدا ان تینوں عالموں کے درمیان اس فقیر پر تقصیر کو سلامت بے کرامت رکھے جب سے میری صحت خراب ہوئی ہے ان کی طرف سے متردد رہتا ہوں۔ "کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد"۔ گھڑی آج تک نہیں رکھی۔ پہچان: قد پانچ فٹ ساڑھے چھ انچ (جوتے پہن کر)۔ عمر کی اس منزل پر آپہنچا ہوں کہ اگر کوئی سنِ ولادت پوچھ بیٹھے تو اسے فون نمبر بتا کر باتوں میں لگا لیتا ہوں۔ میں آپ کو پیدائش کا سال نہیں بتاؤں گا کیوں کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ اوور کوٹ پہن کر بھی دبلا دکھائی دیتا ہوں۔ یوں سانس روک لوں تو ۲۸ انچ کا بنیان پہن سکتا ہوں۔ بڑے لڑکے کے جوتے کا نمبر، ہے جو میرے بھی فٹ آتا ہے۔ اپنے آپ پر پڑا ہوں۔ پسند: غالب، باکس بے، بھنڈی، پھولوں میں، رنگ کے لحاظ سے، سفید گلاب اور خوش بوؤں میں نئے کرنسی نوٹ کی خوش بو بہت مرغوب ہے۔ موتیا پسند ہے۔ پالتو جانوروں میں کتوں سے پیار ہے۔ پہلا کتا چوکیداری کے لیے پالا تھا۔ اسے کوئی چرا کے لے گیا اب محض بربنائے وضع داری پالتا ہوں کہ انسان کتے کا بہترین رفیق ہے۔ گانے سے بھی عشق ہے اسی وجہ سے ریڈیو نہیں سنتا۔ چڑ: جذباتی مرد، غیر جذباتی عورتیں، مٹھاس، شطرنج۔ کافی سے چڑ کی اصل وجہ معدے کے ... داغ ... جن کو میں دو سال سے لیے پھر رہا ہوں اور جو کافی کی تیزابیت سے جل اٹھے ہیں۔ دوسروں کو کیا نام رکھیں۔ ہم بیسیوں چیزوں سے چڑتے ہیں۔ کرم کلا، پنیر، کمبل، کافی اور کاڈکا، عورت کا گانا، مرد کا ناچ، گینڈے کا پھول، اتوار کا ملاقاتی، مرغی کا گوشت، پان دان، فرارہ، خوب صورت عورت کا شوہر۔ کرکٹ آج تک نہ کھیلی ... ہمیشہ چڑ رہی۔ مشاغل: فوٹوگرافی، لکھنا پڑھنا۔ سبھی رنگ پسند ہیں۔ تیز سکار چکار نہیں بھاتی۔ رات کی رانیاں دونوں قسم کی۔ دور کسی اور آنگن ہی سے مہک دیتی اچھی لگتی ہیں۔ جہاں تک حسن کا تعلق ہے دخیرہ دغیرہ پسند ہے۔ ہمیں نام، مردوں کے چہرے، کاروں کے میک، شعر کے دونوں مصرعے، یکم جنوری کا سالانہ عہد، بیگم کی سال

گرہ اور سینڈل کا سائز، کل کے اخبار کی سرخیاں، دوستوں سے خفگی کی وجہ اور نہ جانے کیا کیا یاد نہیں رہتا۔ انٹرمیڈیٹ میں باچھ سے باچھ تک مونچھیں رکھی تھیں۔ میری والدہ بہت اچھی نقاد تھیں۔ جب میں اپنے ماضی میں جھانکتا ہوں تو میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھ پر ان کا بہت اثر ہے۔ غالباً یہ انہی کی حسِ مزاح، گہرے مشاہدے اور تلون مزاجی کا اثر ان کے بیٹے پر ہوا۔ میرے والد بہت سنجیدہ انسان تھے۔ جے پور ریاست کے "مقامی" مسلمانوں میں وہ پہلے گریجویٹ تھے۔ جے پور میونسپلٹی کے چیرمین، اسٹیٹ مسلم لیگ اور دیگر مسلم تعلیمی اور ثقافتی اداروں کے صدر اور اسمبلی کی حزبِ اختلاف کے لیڈر رہ چکے تھے۔ اسمبلی ہی میں سقوطِ حیدرآباد پر، پاکستان کی حمایت میں تقریر کرنے پر انہیں ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ سادہ دل، بے ریا، پابند شرع، فقیر منش اور زبان کے کھرے تھے۔ دل کی بات زبان پر لانے میں انہیں ذرا بھی نہیں سوچنا پڑتا تھا۔ موروثی جائیداد سے وہ اپنے چھوٹے بھائی کے حق میں دست بردار ہو گئے تھے۔ راجستھان میں مسلمانوں کے دیرینہ و بے لوث خدمت گزار اور تحریک پاکستان کے سپاہی کی حیثیت سے سبھی انہیں جانتے پہچانتے تھے۔ والد مرحوم پاکستان آنے لگے تو اپنے پوسٹ آفس سیونگ بینک اکاونٹ میں ساڑھے چار ہزار روپے چھوڑ آئے تھے جو ان کے حساب سے بیس سال کے سود کی رقم بنتی تھی۔ وہ کسی ایسے مسلمانوں کے ہاں دعوت کھانا تو بڑی بات ہے پانی پینا بھی حرام سمجھتے تھے۔ جس کے تعلق انہیں معلوم ہو کہ وہ اپنے اکاونٹ پر سود لیتا ہے۔ وہ ریاست ٹونک میں پولیٹکل سکریٹری رہ چکے تھے۔ جے پور کے پہلے مقامی مسلمان تھے جس نے ۱۹۱۳ میں بی۔ اے کیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ "شبیہ" مکمل ہو تو اس گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ بزرگ جاہ و مال سے بے نیاز تھے فقط ہمیں اپنی نشانی چھوڑا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۹ء ہم جے پور سے چلے ہیں۔ کراچی میں براہ کھوکھرا پار وارد ہوئے۔ وہ صبح نہیں بھولے گی جب ریلوے لائن کے کنارے ایک چھوٹی سی سفید چمکتی تختی پر پہلے پہل پاکستان لکھا نظر آیا تو اسے ہاتھ سے چھو چھو کر دیکھا تھا، پھر مٹی اٹھا کر دیکھی۔ السلام علیکم کہتے ہوئے سندھی ساربان دیکھے۔ ہندوستان کے نوٹ پر پہلی دفعہ حکومت پاکستان چھپا ہوا دیکھا اور پھر ریگ زار راجستھان میں پرکھوں کی قبریں، وہ بولی جو ماں کے دودھ کے ساتھ وجود میں رچی بسی تھی اور اپنے پیاروں کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے، خیرگیٔ امروز میں دھندلاتے چلے گئے۔ منا باؤ سے کھوکھرا پار تک ہندوستان و پاکستان کا سرحدی علاقہ ہم نے اونٹ کی کوہان پر بیٹھ کر طے کیا تھا۔ (اونٹ کے بقیہ حصوں پر دوسروں کا اسباب رکھا تھا)۔ انٹرویو کے دن تک ہماری ٹانگوں کا درمیانی فاصلہ اسی کوہان کے برابر یعنی ایک گز تھا۔ یہ جنوری ۱۹۵۰ء کی ایک ایسی ہی صبح کا ذکر ہے۔ کراچی میں یہ ہماری پہلی صبح تھی۔ گوارا حد تک گرم ہونے کے علاوہ یہ ایک تاریخ ساز صبح بھی تھی۔ زمستان کی اس صبح بینک کاری کے پیشے سے ہمارے طویل "فلرٹیشن" کا آغاز ہوا۔ میکلوڈ روڈ پر بینک کا ہیڈ آفس تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ہم نے ایک چھپی ہوئی پرچی پر اپنا نام لکھ کر جنرل مینجر مسٹر ڈبلیو۔ جی۔ ایم اینڈرسن کو بھجوایا۔ تقریب بہر ملاقات کے خانے میں باریک حروف میں "فرستادہ ... مسٹر ایم اے اصفہانی چیرمین بینک ہذا۔ خیال آیا کہ ملازمت مل بھی گئی تو اپنے باپ کو یہ کیسے بتائیں کہ فرزند نے بہر طور پر روٹی کمانے کے لیے کیا کسب اختیار کیا ہے۔ بچپن میں ہم کبھی کیریر کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتے تھے تو انجن ڈرائیوری کے سامنے یہ بادشاہی بھی ہیچ معلوم ہوتی تھی۔ ہم نے خود کو ہر بہروپ ہر سوانگ میں دیکھا تھا سوائے بینکر کے۔ وہ چوتھی کھونٹ تھی جس طرف جانے کی داستانوں میں سخت مناہی ہوتی ہے لیکن جدھر جانے والا ضرور جاتا ہے اور پچھتاتا ہے۔ ہم نے تادم تقرر دفتر، کسی بینک کو اندر سے نہیں دیکھا تھا البتہ اتنا معلوم تھا کہ اگر کوئی شخص یہ ثابت کر دے کہ اس کے پاس اتنی جائیداد اور سرمایہ ہے کہ قرض کی قطعاً ضرورت نہیں تو بینک اسے قرض دینے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سود جسے حرام ٹھہرایا گیا ہے اور ربا جس کی حرمت میں ہمیں آج بھی شمہ برابر شبہ نہیں ہمارا ذریعہ معاش ہی نہیں۔ بلکہ ہر اعتبار سے غالب و کار آفریں، کار کشا اور کار ساز ثابت ہوگا۔ میرا تقرر، مسٹر ایم اے۔ اصفہانی نے اوور ڈرافٹ ایرو ویز میں کیا تھا میں سول سروس چھوڑ کر ہندوستان سے کراچی آیا۔ کہاں وہ خودداری کہاں یہ سجدہ ناقبول۔ بندہ ناخدا! مزے سے بیٹھے کشکول بجاتے رہو۔ تین برس ڈپٹی کمشنر رہے۔ صاحب تین سال پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ یوں بینک کے بھوت بنے جائیں گے۔ کہیں ڈپٹی

کمشنر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی کرسی اور کہاں بینک کا چار فٹ اونچا اسٹول۔ از بس کہ ہماری ہر تباہی اور خانہ بربادی ہمارے مخدوم مرزا عبدالودود بیگ کی ذاتی نگرانی میں ہوئی۔ ہم نے جاکر انھیں خوش خبری سنائی کہ بینکنگ کے پیشے میں حادثاتی طور پر داخل ہوگئے ہیں۔ اور یوں ہماری زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ اگر ہم نے اپنے دانا دوست میاں محمد شفیع کے مشورے پر عمل کیا ہوتا تو آج ہم ایک ناکام سے بینکر کے بجائے ٹوٹا باسمتی چاول اور کریانہ کے ناکام آڑھتی ہوتے۔ ۳ یا ۴ جنوری ۱۹۵۰ء کا ذکر ہے ہم نے بینک میں قدم رکھا تو دبیز گرم تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھے۔ واسکوٹ کی جیب میں نہایت قیمتی سونے کی گھڑی تھی جو ہماری پرسنالیٹی کے پسماندہ حصوں سے جو سوٹ سے باہر نکلے رہ گئے تھے، قطعی لگا نہیں کھاتی تھی۔ یہ نواب سر ابراہیم علی خاں، والی ریاست ٹونک نے ۱۹۴۸ء میں ابا جان کو بخشی تھی اور انھوں نے ہمیں بی۔ اے میں یونیورسٹی میں اول آنے پر تحفتہً دی تھی۔ سونے کے بٹن بیچ کے مکان کی پگڑی دینے کے بعد "یہی کچھ ہے قاری، متاعِ فقیر"۔

ہم بہ قول مرزا، معاشرے کی وہ پسلی ہیں جس میں کہنیاں مار مار کے آگے بڑھتے ہیں۔ اب جو ٹھنڈے دل سے محاسبہ کرتے ہیں تو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہماری خواری میں ان کی خصوصیت سے زیادہ ہماری اپنی ناسمجھی اور ناتجربہ کاری کو دخل تھا۔ ہم جوان تھے، بر خود غلط تھے (بر خود غلط تو آج بھی ہیں، مگر پہلی خرابی دور ہو چکی ہے)۔۔۔ کامیاب بینکر بننے کے لیے پچھتر فی صد یاری، پچاس فی صد عیاری اور پچیس فی صد نہاری درکار ہے۔۔ یہ تو ڈیڑھ سو فیصد ہو گیا۔۔ یہ پروفیشن تو ڈیوڑھا آدمی مانگتا ہے۔ آدھے پونے آدمی سے کام نہیں چلنے کا۔ دنیاوی پیشے مثلاً بینک کاری، مکمل توجہ مانگتی ہے اور یہ پیشے حاسد خواتین کی طرح ہوتے ہیں۔ اسپورٹ کا زمانہ تھا۔ کام بے اندازہ، آدمی کم۔ ہم چار آدمیوں کے برابر کام اور آٹھ آدمیوں کے برابر غلطیاں بڑی تن دہی سے کر رہے تھے۔ ایک منحوس صبح خبر آئی کہ ٹنڈو آدم میں اخبار پڑھتے پڑھتے ابا جان پر دل کا دورہ پڑا اور زمین نے اپنی امانت واپس لے لی۔ حیدر آباد میں ان کی تدفین کے سلسلے میں تین دن کی رخصت اتفاقیہ لینے کی پاداش میں یعسوب الحسن غوری نے ہماری تنخواہ کاٹ لی، جو کچھ عرصہ بعد اینڈرسن نے اس "وارننگ" کے ساتھ واپس دلوادی کہ آئندہ اس واقعہ کو نہیں دہرایا جائے گا۔ ۲۶ جون ۱۹۵۰ء کو روزے کی حالت میں ابا جان پر ٹنڈو آدم میں اچانک دل کا دورہ پڑا اور بے ہوش ہوگئے۔ کسی عطائی نے نہ جانے کیا سمجھ کر کونین کا انجکشن لگا دیا اور وہ آن کی آن میں سارے بکھیڑوں بندھنوں سے آزاد ہوگئے۔ انتقال کے بعد کسی اللہ کے بندے نے ان کی میت ٹرک میں رکھ کر حیدر آباد پہنچادی۔ غریب شہر کی لاش تین چار گھنٹے تک سڑک کے کنارے جون کی لو میں اس انتظار میں بے گور و کفن پڑی رہی کہ اگر کوئی وارث ہے تو آئے اور اس مٹی کے ڈھیر کو پہچان کر لے جائے۔ ان کے خدا نے ان کی بے بسی کی شرم رکھ لی۔ دوسرے دن غروب آفتاب سے ذرا دیر پہلے سیدھے حیدر آباد کے پھلیلی قبرستان پہنچے تو کافی انتظار کے بعد قبر آدھی بند کی جاچکی تھی۔ ان کا چہرہ پرسکون تھا، زردی نے ماتھے پر سجدے کے نشان کو زیادہ واضح کر دیا تھا۔ ایک جھلک دیکھی پھر اس کے بعد کچھ نظر نہ آیا۔ انتقال سے کچھ دن پہلے وہ چند گھنٹوں کے لیے کراچی آئے تو ٹاٹ کے ایک تھیلے میں اپنا کھانا ساتھ لائے تھے کہ تنگ حوصلہ بیٹے نے جو رزق تلاش کیا اس میں سود کی آمیزش تھی۔ زندگی میں جس نے ان کی کوئی خدمت نہ کی، اسے انھوں نے کندھا دینے کی سعادات سے بھی محروم رکھا۔ قبر پر نہ گلابوں کی چادر نہ چنبیلی کا ڈھیر۔ نہ گھر پہ آہ و بکا کا شور۔ وہ تھے تو گھر اتنا بے سروسامان نظر نہیں آتا تھا ماں نے سر پر ہاتھ رکھا اور کلائی کو میلی چادر سے چھپا لیا۔ اب اپنے خاندان، بے روزگار بھائی اور اس کے بیوی بچے، بہن اور اس کے کنبے اور ان گرد گھومنے والے طفیلی سیارے۔۔ ان سب کی خور و نوش کا انتظام، بلکہ کہنا تو یہ چاہیے کہ فاقہ کروانے کی اخلاقی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی تھی۔ ایک دن یوں ہی خیال آیا تو مشقی سوال کے طور پر ہم نے اپنی تنخواہ کو کنبے کے لواحقین اور لواحقین کے متوسلین پر تقسیم کیا تو مقسوم ۲۳ روپے پونے چار آنے نکلا۔ کسی طرح یقین نہ آیا کہ ایک آدمی ۲۳ روپے میں بسر اوقات کر سکتا ہے۔۔۔ مگر زندگی بندھنوں سے زیادہ لچک دار نکلی۔ انسان بڑا سخت جان ہے۔ ان اوصافِ حمیدہ اور خصائل ستودہ کی زیادہ تشریح و تشہیر یہاں اس لیے بھی غیر ضروری ہے کہ سارا اردو لٹریچر۔۔۔ از ولی دکنی؟

ایں دم... قناعت اور مفلسی کے فائدوں اور فضیلتوں سے بھرا پڑا ہے... نوابی گھڑی اب واسکوٹ کی جیب سے نکل کر پتلون کی جیب اور طلائی زنجیر بیگم کے گلے میں پہنچ چکی تھی۔ بیگم نے ہمیں ایک دن اطلاع دی کہ ہماری تنخواہ ۱۲ تاریخ تک کے لیے بالکل ناکافی ہوتی ہے تو ہمیں پوپ گریگری پر بڑا غصہ آیا جس نے عیسوی کیلنڈر کی ترتیب و اصلاح کرتے وقت یہ تباہ کن فیصلہ کیا تھا کہ کوئی مہینہ ۲۸ دن سے کم کا نہ ہوگا۔ ظالم کو اصلاح ہی کرنی تھی تو ٹھیک سے کرتا۔ ابھی تک یاد ہے جاڑوں کے دن تھے۔ رات کے بارہ بجے تھے ہم مع اپنے چار بچوں اور بیوی کے پیر الٰہی بخش کالونی کے کوارٹر کے چھوٹے سے کمرے میں فرش پر دیاسلائیوں کی طرح ایک طرف سر کیے پڑے تھے... ہمارے تصرف میں ایک ہی کمرہ تھا۔ بینکوں میں ان دنوں صبح ساڑھے آٹھ بجے سے رات کے دس گیارہ بجے تک لگاتار کام ہوتا تھا جب کہ گورنمنٹ دفاتر کے اوقات بے کاری نو سے ساڑھے چار تک تھے۔ اول تو رات گئے تک کام کرنے کی کوئی شکایت نہیں کرتا تھا اور اگر کوئی سر پھرا آواز اٹھاتا تو اس کا تبادلہ بارش میں چٹا کانگ، گرمی میں سکھر اور سردی ہو تو کوئٹہ کر دیا جاتا تھا۔ ہمیں یاد نہیں کہ دو ڈھائی سال تک ہم نے اور ہمارے ساتھیوں نے کبھی چودہ گھنٹے سے کم کام کیا ہو۔ دن رات کا فرق مٹ چکا تھا... دوپہر کو کم ہی لوگ کھانا کھاتے تھے... عملے کے بیش تر افراد، منجملہ راقم آثم، ایرانی ہوٹلوں کی طرف چہل قدمی کر کے بے کھائے پیے واپس آجاتے۔ جہاں تک ہماری عادات کا تعلق ہے ہوا خوری کا یہ سلسلہ ۱۹۵۴ء تک جاری رہا۔ کوئی کسی سے نہیں پوچھتا تھا کہ آج بھی تم نے کھانا کھایا یا نہیں۔ آٹھ نو بجے رات تک پیٹ کا الاؤ بھڑک اٹھتا... کبھی بھوک کو نکوٹین یا پان سے بہلاتے رہتے تھے۔ کچھ دن بعد ایسا بجوگ پڑا کہ سگریٹ پینے کی بھی استطاعت نہ رہی۔ استطاعت سے ہماری مراد ساٹھ ستر ہے کہ یہی ہمارا اوسط تھا۔ بری بات اور بری عادت کا صحیح لطف و لذت دراصل کثرت و زیادتی (EXCESS) میں ہی آتا ہے۔ صاحبو! اعتدال پر اتنا ہی اصرار ہے تو نیکی میں کرو۔ کون روکتا ہے؟ از بس اعتدال کو طبیعت نے کبھی قبول نہ کیا، ہم نے سگریٹ کم کرنے کی بجائے بالکل چھوڑ دیے اور جو شاندے سے کشید کی ہوئی ملباری چائے کے قدح کے قدح چڑھا کر بھوک اور نیند کو بھگاتے رہے۔ تین دن ہوئے بچی سخت بیمار تھی اس کے لیے انجکشنوں کی ضرورت پڑی۔ ہم نے یونیورسٹی میں اول آنے کی گولڈ میڈل جو کئی سال سے بے کار پڑا تھا، پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے ہاتھ میٹھا در (صرافہ) میں بکوا دیا۔ ڈھائی تولے کا طلائی تمغہ ۲۷ روپے میں بکا۔ آگرہ یونیورسٹی نے چاندی پر سونے کا پتر چڑھوا دیا تھا۔ خان صاحب... دوسرے دن لنچ کے وقفے کے بعد ہمارے پاس آئے اور علاحدہ لے جا کر ایک لفافہ ہمیں تھما دیا۔ اس میں ہمارا گولڈ مڈل تھا۔ ان کی انگلی میں انگوٹھی نہیں تھی۔ ایک برانچ منیجر نے زنجبار الیکٹرک کمپنی کو ایک ریڈیوگرام اور استری کے نذرانے کے عوض ساڑھے چار لاکھ روپے ہیڈ آفس کی اجازت و منظوری کے بغیر چپ چاپ قرض دے دیے... اور اب اس کا مالک نورالحسن شیخ نقل مکان و دکان کر کے ڈھاکہ چلا گیا... شام تک حکم ہوا کہ اس کیس کی تحقیقات اور رقم کی وصول یابی کے لیے ہمیں پہلی فلائٹ سے ڈھاکہ جانا ہوگا۔ چناں چہ ہم بہ امتثال امر دوسرے دن ڈھاکہ پہنچ گئے۔ ڈھاکہ مسجدوں کا شہر کہلاتا ہے۔ فجر کی اذانوں کے بعد ہر تیسرے گھر لڑکیوں کے گانے اور ہارمونیم کی آواز سنائی دی۔ دفتر پہنچے تو بینک کے جرمن منیجر نے شکایت کی کہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا بنگالی منیجر کمرشیل بینکوں کی روز مرہ کی ضروریات کے ملیے بھی ڈھاکہ سے کراچی روپیہ بھیجنے میں پس و پیش کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ بنگال ہی میں رہنا چاہیے۔ یاد رہے، پاکستان بنے ابھی دس سال بھی نہیں ہوئے تھے!... گھر واپس آئے تو سوغات میں فقط اپنے آپ کو لائے۔ لیکن جب ہم نے ذرا تفصیل کے ساتھ بتایا کہ کرنافلی پیپر ملز میں ہمارے ہم شکلوں کو کس طرح چھانٹ چھانٹ کر بے دردی سے قتل کیا گیا اور پھر دیکھتے دیکھتے ہزاروں آدمی بیٹھے میں چٹ پٹ ہوئے تو سب نے ہماری خالی ہاتھ واپسی کو ہی غنیمت جانا۔ بیوی اور بچے شکر بجا لائے کہ ہم نے اپنی چالاکی سے ان کو بالترتیب بیوہ اور یتیم ہونے سے بچا لیا۔ بینک میں ملازم ہوئے ہمیں مشکل سے تین سال ہوئے ہوں گے کہ اینڈرسن نے ازراہ مرحمت ہمیں چیف اکاؤنٹنٹ بنا دیا۔ سیکریٹری اور انسپکٹر آف برانچس کے عہدوں پر ہم پہلے سے ہی فائز تھے۔ ہماری دن دونی رات تگنی ترقی کو کل ۱۵ آنے کا نقصان ہوا اس لیے کہ تین ربڑ اسٹامپ بنوانے پر اس زمانے میں یہی لاگت آتی

تھی۔۔۔ ہمیں یاد نہیں کہ ڈھائی تین برس تک کبھی گیارہ بجے رات سے پہلے بینک سے فراغت ہوئی ہو۔۔۔ چند مہینوں سے سینے میں بھی دائیں طرف درد رہنے لگا تھا جس کا نوٹس لینا ہم نے کسرِ شان سمجھا اس لیے کہ دل تو بائیں طرف ہوتا ہے۔ تکلیف نے جب اتنی شدت اختیار کی کہ محسوس ہونے لگا چوبیس گھنٹے کوئی برمے سے سینہ چھید رہا ہے کہ پیٹھ کے آرپار ہوا جاتا ہے تو ایک ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے نرمی سے کہا کہ دایاں پھیپھڑا متاثر معلوم ہوتا ہے۔ پوچھا کاہے سے؟ رکھائی سے بولا "آف کورس" ٹی بی" فوراً ایکس رے، خون اور تھوک ٹیسٹ کروانے اور تین مہینے کی رخصت پر کوئٹہ یا مری جانے کی ہدایت کی۔ ڈیڑھ سال بعد جب ہماری مالی تکالیف میں افاقہ ہوا تو ایکس رے کروایا۔ اس سے تصدیق ہوئی کہ دائیں پھیپھڑے پر ایک زخم تھا جو کبھی کا خود بہ خود مندمل ہو چکا ہے اس سے ہمیں اپنی قوت ارادی کی مضبوطی کی داد مطلوب نہیں، بلکہ ٹی بی کے جراثیم کی نقاہت اور بوداپن دکھانا مقصود ہے۔

اس زمانے میں اس روٹ پر کل تین بسیں چلتی تھیں۔ ایک تو کانی بھی تھی۔ وہ دس بجے بند ہو جاتی تھیں۔ اکثر سات میل پیدل ہی گھر جانا پڑتا۔ خواہ رات کے تین بج جائیں، آندھی آئے، بارش آئے۔۔۔ اور چاہے تو بس ہی کیوں نہ آجائے۔۔۔ ہم گھر ضرور جاتے تھے۔ حالاں کہ بینک میں کس چیز کی کمی تھی۔ لاکھوں کا روپیہ، پنکھے، کمر سیدھی کرنے کے لیے میزیں، حفاظت کے لیے سنتری، رات بھر کام کرنے کے بعد منھ دھونے اور اسے دیکھنے کے لیے واش بیسن اور آئینہ۔۔۔ سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے بیوی کے سوا۔ لیکن صاحبو! جو سکھ چھجو دے چوبارے، وہ نہ بلخ نہ بخارے۔ گھر پہنچتے تو بیوی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھتی، تام چینی کے تسلے میں سہاتا سہاتا گرم پانی اور دو چمچے نمک ڈالتی اور ہم اس سلونے تسلے میں سانولے پاؤں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ کسی نے بتایا کہ اس سے پیروں کی سوجن اتر جاتی ہے۔ ٹھیک ہی ہوگا، اس لیے کہ صبح آئینے میں چہرہ کافی ستا ستا نظر آتا تھا۔ صبح بھی اتنی تکان محسوس ہوتی گویا شام ہو۔ مشقت سی مشقت، تھکن اور ایسی اٹوٹ تھکن کہ ایک ایک مسام میں اتر جائے اور ہڈیوں تک کو چٹخا دے۔ رواں رواں کراہنے لگتا۔ کبھی کبھی بے اختیار جی چاہتا، اب کے ایسے سوئیں کہ پھر نہ اٹھیں:

کچھ اڑھا دیجیے مولا مجھے نیند آتی ہے

پھر کھانا گرم کیا اور دونوں ساتھ کھاتے۔ وہ ایک پرائیوٹ اسکول میں پڑھانے لگی تھیں۔ تنخواہ دونوں بچیوں کے دودھ کے ڈبوں کے برابر!۔۔۔ ہمارے درمیان ایک خاموش معاہدہ تھا کہ کوئی یہ نہیں بتائے گا کہ دن کیسا کٹا۔ ان کے لیے ہمارے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ خدا ان کا سہاگ رہتی دنیا تک قائم رکھے۔ انھوں نے ہماری عادتیں خراب کر دی ہیں اور ہم گھر گرہستی سے اتنے بے خبر ہیں کہ آج بھی یہ نہیں بتا سکتے کہ ہمارے کرتے میں کتنا کپڑا لگتا ہے، کریلا کون سے موسم میں آتا ہے، گوشت کہاں سے آتا ہے، ساڑی کا عرض کیا ہوتا ہے، چیچک کا ٹیکہ کس عمر میں لگوایا جاتا ہے، ایک سیر بریانی میں کتنی چھٹانک نمک پڑتا ہے؟ پھر صبح چھ بجے اٹھ جاتے اور سات تک تیار ہو کر پیدل گرومندر پہنچتے۔ وہاں سے بس آسانی سے مل جاتی تھی۔ تجربے نے ثابت کر دیا تھا کہ ڈھائی تین میل پیدل چلنے میں، پیر الٰہی بخش کالونی کے بس اسٹینڈ پر دھینگا مشتی کرنے کے مقابلے میں آدھا پسینہ بھی نہیں آتا۔ ۸۔۳۰ تک دفتر پہنچ جاتے اور پھر اس چکی میں پستے جس کے دو پاٹن بیچ آج تک کوئی ثابت نہ پہنچا۔ پالتو جانور کی چپ دسراتھ اور اس کا پیار کتنا بھرپور ہوتا ہے اس کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب آدمی دکھی ہوا تھا۔۔۔ بارش کے دن تھے جھڑ لگ رہی تھی۔ ایسی بارش اور ایسی چھت کراچی میں پھر کبھی نہیں دیکھی۔ (نامکمل) ☆

●☆●☆●

●☆●

خاکہ

اشفاق احمد درک

مشتاق یوسفی ادبی کٹہرے میں

ہمارے یہاں یہ روایت ہے کہ کوئی شخص اگر ایسا کام کر بیٹھے جس کا پہلے اس ملک میں رواج نہ ہو تو اسے یا تو سزا سنا دی جاتی ہے یا وہ ملک سے بھاگ جاتا ہے۔ اردو ادب میں بھی ایک شخص نے ایسی ہی حرکت کی اور "سزا" کے خوف سے وطن سے بہت دور دیار غیر میں جا بیٹھا۔ "راجستھان کا یہ رانگھڑ" جس کا گھر والوں نے کسی ناول کے ایک کردار پر عام سا نام رکھا ہے۔ جسے اس نے خصوصیات کی سان پر ایسا چڑھایا کہ اس کے سوا ہر نام عام لگنے لگا۔ غالب، باکس بے اور بھنڈی کو ایک ہی نظر سے دیکھنے والا یہ مزاح نگار پہلے اپنے ملک کے لوگوں کو نازنینوں کے قصے مزے لے لے کر سنایا کرتا تھا۔ آج کل خود میموں کے اس شہر پر ہجوم میں ہے جہاں کے قہوا خانوں قحبہ خانوں میں شور و ہنگم کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اکثر اوقات بندے کو اپنی حرکتوں کا بھی پتہ نہیں چلتا اور ہر بار دوسروں سے پوچھنا پڑتا ہے کہ میں نے کیا کیا ہے؟ اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ "ہمارے ہاں ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسے ہنسنا اور کھانا آتا ہے اسی وجہ سے پچھلے سو برسوں سے یہ فن ترقی نہیں کر سکا، چنانچہ اس نے یہی بات ذہن میں رکھتے ہوئے ہنسنے کے فن میں پورے سو برس کی کسر نکال دی اور مزاح کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ اب شاید سو برس تک یہ شکایت پیدا نہ ہو سکے۔

یہ خوش عقل لکھاری غیر سنجیدہ ادب میں تین کتابیں لکھنے کا مرتکب ہوا جن میں مزاح گھسا پڑا ہے جیسے سمندر میں پانی۔ یہ عام سے الفاظ، محاورات اور فقروں کو تخیل کے سورج میں اس قرینے سے انڈیلتا ہے کہ اس سے ہنسی، خلوص، علم و آگہی اور شرارت کی وہ شوخ کرنیں پھوٹی پڑتی ہیں جو جب بھی کسی کے نظر و شعور سے ٹکراتی ہیں تو ہنسی، گرمیوں کے دن، مہنگائی اور لڑکی کی جوانی کی طرح بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

یہ اردو ادب کا واحد ادیب ہے جس کی پیٹھ پیچھے بھی تعریف ہی کی جاتی ہے۔ اس کی تحریروں سے ہنسنے والے مقام ڈھونڈنے نہیں پڑتے۔

ساری عمر حساب میں فیل ہونے کو اپنے مسلمان ہونے کی تمامی دلیل سمجھتا رہا لیکن قسمت کی خوبی دیکھئے کہ ایک ایسے محکمے میں افسر ہو گیا جہاں حساب کتاب میں ایک پائی کی کمی بیشی سے معاملہ "رائی زور خودی سے پربت، پربت ضعف خودی سے رائی" والا ہو جاتا ہے۔ اور جہاں پابندی وقت کا نمبر ایمانداری سے بھی پہلے آتا ہے۔ ملازمت کے دوران اول الذکر کا اسے اس قدر پاس رہا کہ موخر الذکر کو بھولتا چلا گیا۔ لواحقین ادب کو یہیں ہنستا چھوڑ کر خود راہی ملک مس ہیمیں بدن ہوا۔ لندن کی ہوا کھا کر سویوں کا مزا ایسا بھولا کہ ہمیں کرارے مزاح کی چاٹ لگا کر خود

قشقہ کھینچا غیر میں بیٹھا، کب کا ترک یہ کام کیا

اس نے اردو مزاح میں کچھ ایسی "زیادتیاں" کی ہیں جس سے اردو ادب کبھی بھی چشم پوشی نہیں کر سکتا لہذا میں اس کی انہی ادبی "زیادتیوں" کی نشاندہی کرتے ہوئے ملک کے ادبی وڈیروں (زمین داروں) سے گزارش کروں گا کہ ملزم کو اس کے کئے دھرے کا سزا وار ٹھرایا جائے۔ میں نے "کسر شکایتی" سے کام لیتے ہوئے محض چونتیس الزامات ہی پر اکتفا کیا ہے کیونکہ بقول شاعر:

حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے

آخر نثر نگار ہے شاعر نہیں ہے یہ

۱۔ اس نے اردو مزاح کو اس مشکل مقام پر پہنچا دیا ہے جس سے آگے لے جانا کسی دوسرے مزاح نگار تو کیا اس کے اپنے بس میں بھی نہیں۔ میرا دوست مسٹر الو تو یہاں تک کہتا ہے کہ یہ کتابیں اس کی اپنی لکھی ہوئی ہی نہیں ہیں جس کا جواز اس کے پاس یہ ہے اگر یہ کتابیں ملزم مصنف نے خود لکھی ہیں تو ایسی دو تین کتابیں اور لکھ کے دکھائے۔

۲۔ اس نے بعض شعراء کے متعدد اشعار اور مصرعوں کو ہلکے سے ردو بدل سے اپنی تحریروں میں یوں استعمال کیا ہے کہ اب وہ اشعار اور مصرعے اصل شعرا کے معلوم ہی نہیں ہوتے۔ بلکہ بعض مصرعوں کو تو جوں کا توں قبضے میں لے لیا ہے۔ ایک مثال دیکھئے "بینک میں لکھتے سب انگریزی میں تھے، گفتگو اردو میں، لیکن گالی ہر شخص اپنی مادری زبان میں ہی دیتا: زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے"۔ یہ مصرع جب بھی سنیں گے آتش یاد آئے نہ آئے مشتاق یوسفی ضرور یاد آئے گا یعنی چوری اور دماغ زوری۔

۳۔ اس نے اردو زبان کے محاورات، ضرب الامثال اور روز مروں کو اس مہارت سے بگاڑا ہے کہ اب وہ اپنی اصل شکل میں مزا ہی نہیں دیتے۔

۴۔ اس نے بعض نامور لکھنے والوں کے اسالیب کو نہایت چالاکی سے گھلا ملا کر ایک ملغوبہ تیار کیا اور اسے کئی آتشہ کر کے اپنے نام سے پیش کر دیا۔

۵۔ اس نے مغربی مزاح کے ذرائع کو اس صفائی سے اڑایا ہے کہ عام کیا خاص آدمی کو بھی یہ پتہ نہیں چلتا۔

۶۔ اس نے اپنی تحریروں میں جا بجا فحاشی و عریانی کے "ٹوٹے" ٹانکے ہیں۔ یہ اگرچہ ہمارے ہر بڑے ادیب کا خاصہ ہے لیکن اس کا جرم یہ ہے کہ اس نے "بے حیائی" کو اتنا مزیدار بنا دیا ہے کہ اسے بار بار پڑھے بغیر چارہ ہی نہیں ہوتا۔

۷۔ اپنی کتابوں کے مدحیہ دیباچے نہ لکھوا کے اس نے ہمارے ادبی مشاہیر کی بے ادبی کا ارتکاب کیا ہے۔

۸۔ ایک الزام نقادوں کو ورغلانے کا بھی ہے کہ جو نقاد اسے "چراغ تلے" لکھنے تک گھاس بھی نہیں ڈالتے تھے۔ وہ اب اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور بعض نقادوں کو تو اس نے رشوت تک دی ہے۔ جو اردو مزاح کو اسی کے نام سے منسوب کرتے پھرتے ہیں۔ کوئی اس کے مزاح کے عہد میں جی رہا۔ کوئی اس کے مزاح پہ مر رہا ہے۔

۹۔ اس کے یہاں موجود نہ ہونے کی وجہ سے نقادوں کو اس میں خامیاں تلاش کرنے میں خاصی دقت پیش آ رہی ہے۔

۱۰۔ اس کی تحریروں پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ہم جب بھی اس پر تحقیق و تنقید کا کام مکمل کر لیتے ہیں۔ اس کی تحریروں سے نئے نئے پہلو نکلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ عجیب و غریب گوشے آشکار ہونے لگتے ہیں۔ اس صورتحال نے ہمارے نقادوں اور محققین کو خاصا مشکل میں ڈالا ہوا ہے۔

۱۱۔ اس نے کسی قسم کا تحقیقی و تنقیدی کام کئے بغیر ادب میں نام پایا ہے۔ حالانکہ ہماری ادبی مقننہ نے صرف تحقیق و تنقید ہی کو ادب میں قابلیت کا معیار گردانا ہے۔ اسے چاہئے کہ اپنی تیزی سے پھیلتی ہوئی شہرت اور بڑھتے ہوئے وقار پر خود ہی پابندی

لگائے اور اس غیر قانونی شہرت پر نقادوں اور محققوں سے معذرت کرلے۔

۱۲۔ اس نے مختلف معروف ادباء و شعراء کے بارے میں رائے دیتے ہوئے ہمارے پیشہ ور رائے بازوں کی طرح دروغ مصلحت آمیز کی بجائے راستی فتنہ انگیز سے کام لیا ہے اور بڑی بے لحاظی کا ثبوت دیا ہے جس سے اس پر سقراط والی حدود بھی لاگو ہو سکتی ہیں۔

۱۳۔ ایک بات اس کی اور ہمیں کھٹکتی ہے اور کھٹکتی رہے گی کہ یہ ادبی حلقوں میں لوگوں سے دست و گریباں ہوئے بغیر ہی شہرت دوام پا گیا ہے۔

۱۴۔ اس نے لکھنے لکھانے میں کسی ادبی پیر و مرشد کی پیروی بلکہ نقل نہ کر کے ہماری تہذیب کو رسوا کیا ہے۔

۱۵۔ اس نے چپکے چپکے رات دن آنسو بہانے کی بجائے اتنی مقبولیت حاصل کر لی ہے کہ یونیورسٹی والوں کے لئے مصیبت بن گیا ہے۔ یہ یا تو اپنا تمام مقام و مرتبہ واپس لے لے اور یا چپکے سے مرجائے تاکہ یونیورسٹی والے اس پر ایک عدد مقالہ لکھوا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکیں۔ اس بات کا فیصلہ بعد میں ہوتا پھرے گا کہ:

دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

۱۶۔ پبلشرز حضرات اس کی کتابیں اتنے اچھے کاغذ پر اتنی عمدہ کتابت کے ساتھ بار بار چھاپ رہے ہیں جس سے ہمارے کئی مصنفین کی دل آزاری ہوتی ہے۔

۱۷۔ اس نے قارئین کو اپنی تحریروں کے ذریعہ ایسا نشہ فراہم کیا ہے کہ جو بندہ ان کو سمجھ کے پڑھ یا پڑھ کر سمجھ لیتا ہے اس کا کسی اور مزاحیہ تحریر میں دل ہی نہیں لگتا۔

۱۸۔ لوگ اس کی کتابیں اتنی بے دردی سے خرید اور بیچ رہے ہیں جس سے کئی دوسرے لکھنے والوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

۱۹۔ اس ملامتی مزاح نگار نے اپنی مختلف تحریروں میں اپنی اس قدر بے عزتی کی ہے کہ اس پر ہتک عزت کا کیس ہو سکتا ہے۔ اس نے تعلی جیسے نہایت اہم ادبی رجحان کو گھاس تک نہیں ڈالی۔ آخر self respect بھی کوئی چیز ہوتی ہے جس کا اسے ذرہ برابر بھی پاس نہیں۔ ایک تو یوسف جیسے خوبصورت نام کو بگاڑ کے یوسفی کر دیا۔ اوپر سے اس قدر کسر عزتی سے کام لیتا ہے کہ پڑھنے والے کو شرم آنے لگتی ہے۔

۲۰۔ اس نے بنک میں ملازمت کرتے ہوئے ادب تخلیق کر کے ایک تو لکھنے لکھانے والوں کے پیشے میں بے جا مداخلت کی ہے، دوسرے بنک کی متعدد کانفی ڈینشل (Confidential) قسم کی خامیوں اور غلطیوں کو طشت از بام کر دیا ہے۔

۲۱۔ اس نے اپنی شریر سوچ اور اوٹ پٹانگ حرکتوں کو بھولے بھالے کرداروں کے سر منڈھ دیا ہے۔ مسٹر الّو کا تو یہ تک کہنا ہے کہ اس نے مرزا عبد الودود بیگ اور پروفیسر قاضی عبد القدوس کے فرمودات اور سیرت کے مختلف پہلوؤں کو جمع کر کے اپنے نام سے چھپوا دیا ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس کی تحریروں سے مرزا اور قاضی کا حصہ نکال دیا جائے تو وہی کچھ بچتا ہے جو اس کے پورے نام سے "یوسفی" کا لفظ نکال دینے سے۔

۲۲۔ اس کی تحریر پڑھ کر ہنسنے کے لئے بار بار سوچنا پڑتا ہے جس سے ہماری تہذیبی روایت کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو مضمون اتنا مہمل ہو جاتا ہے کہ خوبصورت لڑکی سے ترنم سے پڑھانے پر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔

۲۳۔ اس نے مزاح نگاری میں سیدھی سادی باتوں کی بجائے ادق الفاظ، گمبھیر خیالات اور گھسے پٹے تہذیبی رچاؤ کو اس شدت سے

اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے کہ عام قارئین کو ان کے نیچے سے گزرنا پڑتا ہے ۔ ہمارے محکمہ تعلیم کو اسے ایف اے، بی اے کے نصاب میں شامل کرتے ہوئے دبی ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے جو ایک ڈاکٹر کو سیٹتھوسکوپ کے ذریعے کسی نوجوان لڑکی کے دل کی دھڑکن چیک کرتے ہوئے ۔ سنا ہے ہمارے کالجز کے اساتذہ نے انہیں ایف اے اور بی اے میں شامل کرنے کی کھلے دل اور بند ذہنوں کے ساتھ بھرپور خلاف ورزی کی ہے ۔

۲۴۔ یوسفی نے مزاح نگاری کے قائم کردہ بہت سارے اصولوں سے انحراف کیا ہے جس پر اسے بغاوت کے جرم میں بھی اندر کیا جاسکتا ہے ۔

۲۵۔ اس نے کوئی ایسا موضوع یا بات چھوڑی ہی نہیں جس پر آنے والے طبع آزمائی کر سکیں، بلکہ ہمارے تے لکھنے والوں کو تو ایک بڑی شکایت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی پوری استعداد اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کوئی مزیدار پیروڈی یا پھڑکتا مچلتا ہوا فقرہ لکھ ڈالیں تو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ فقرہ اور پیروڈی تو یوسفی صاحب آج سے بیس پچیس سال پہلے ہی لکھ چکے ہیں ۔ یہ صورتحال نئے لکھاریوں کے لئے واقعی پریشان کن ہے ۔ لیکن اس کا کوئی حل ۔ خود ہی بتلائیے کہ ہم بتلائیں کیا ۔

۲۶۔ اس کے بعض کرداروں کے نام اتنے مشکل ہیں اور ان میں "ع"، "غ"، "خ" اور "ق" کا اس کثرت سے استعمال ہے کہ انہیں صحیح مخرج کے ساتھ ادا کرتے ہوئے کسی کمزور حلق قاری کا انتقال بھی ہوسکتا ہے مثال کے طور پر کچھ کرداروں کے نام صبغت اللہ صبغے، قاضی عبدالقدوس، نحاس پاشا کنجو، یعسوب الحسن غوری، فرغام الاسلام صدیقی عرف فرغوس ۔ شیخ شمس الحق تلمیذالرحمٰن چاکسوی وغیرہ ۔

۲۷۔ اس نے مرنے سے بہت پہلے ہی نامکمل سوانح عمری (داستان امیر رمزہ) شتابی سے لکھ کر جلد بازی اور غیر مستقل مزاجی کا ثبوت دیا ہے ۔ حالانکہ ہمارے بعض لکھنے والے تو اس وقت تک قلم ہاتھ سے نہیں چھوڑتے جب تک منکر نکیر آکر ان کے اعمال اور فن کا حساب کرنے کے لئے قلم ادھار نہ مانگ لیں ۔

۲۸۔ اس نے آج تک کسی پرچے کے ایڈیٹر کو "یوسفی نمبر" نکالنے پر مجبور نہیں کیا تاکہ تنقیدی مضامین میں اس کے چھپے ہوئے نقائص سامنے نہ آجائیں ۔

۲۹۔ ہمیں تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ اس کی مقبولیت کا ایک بڑا راز یہ بھی ہے کہ اس نے کسی کتاب پر اپنی تصویر نہیں چھپوائی بلکہ تصویر والی جگہ پر تعریفی کلمات درج کروائے ہیں ۔ کتاب تو ایک طرف ہم نے تو کسی اخبار رسالے میں کبھی اس کی "مورتیا" نہیں دیکھی ۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی شکل ویسی ہی ہوگی جیسی یہ خود بیان فرماتے ہیں ۔ ہماری گزارش ہے کہ اس کی ہر کتاب کے پورے صفحہ پر اس کی "اصلی والی" تصویر لگائی جائے ۔

۳۰۔ اس نے ادب میں چونتیس سال قلم گھسنے کے باوجود صرف تین کتابیں لکھیں لہذا اس کی اس سست روی کا بھی سختی سے نوٹس لیا جائے ۔ اور کچھ نہیں تو یہ دس بیس سفر نامے ہی لکھ ڈالتا ۔

۳۱۔ جب تک وہ بے نشان رہا دسترس میں تھا
خوش نام ہوگیا تو ہمارا نہیں رہا

۳۲۔ سچی بات تو یہ ہے کہ عالمی پیمانے کی اس درجہ معلومات، زبان و مکان کے حوالے سے مختلف تہذیبوں کا اتنا گہرا رچاؤ، کابرین عالم کے اقوال کا ازبر ہونا ۔ مختلف زبانوں ۔ (اردو، پنجابی، مارواڑی، انگریزی، سندھی) پر اس قدر اختیار، ہر شعبے میں جزئیات

نگاری کا یہ عالم، ہر طبقۂ فکر کے لوگوں کی نفسیات سے واقفیت، مذہب، سائنس، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، فنون لطیفہ، سیاست، ادب، کھیل، شوبزنس وغیرہ۔ غرض یہ کہ تحریر میں اس درجہ "کثرت آرائیاں" کسی اکیلے آدمی کے بس کا روگ ہی نہیں۔ یہ کسی پورے گروہ کی کارستانی ہے۔ ادبی سراغرسانوں کے ذریعہ ان کی نشاندہی کی جائے۔

۳۳۔ اس کی تحریروں نے ہماری پڑھنے کی رفتار کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا ہے۔ کہاں ہم ایک ایک دن میں تین تین سو صفحات آرام سے ایک بار پڑھ لیتے تھے اور کہاں اب یہ صورت ہے کہ اچھا بھلا قاری تین چار صفحوں ہی میں روز و شب کی طرح الجھ کے رہ جاتا ہے۔ ایک بار پڑھ کے پھر پلٹنا پڑتا ہے کہ یہ کہہ کیا گیا ہے؟ اور اسی پلٹنے جھپٹنے میں یہ دھیان ہی نہیں رہتا کہ

ابھی رشک کے امتحاں اور بھی ہیں

۳۴۔ ہمارا چونتیسواں اور آخری الزام یہ ہے کہ اس نے کسی دبستان سے تعلق رکھے بغیر اور بلا کسی سیاسی وابستگی کے ہمارے ادبی سیٹھوں سے سرٹیفکیٹ لیے بغیر یہ سب کچھ کیا ہے۔ لہٰذا اس غیر قانونی طرز عمل پر اس کے خلاف یکطرفہ کاروائی کرتے ہوئے اس کے پورے ادب کو بغیر کوئی وجہ بتائے بیک جنبش قلم منسوخ کیا جائے۔

ملزم کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اس کے پاس ان الزامات کا کوئی مدلل و مکمل جواب ہے تو یہاں ادبی کٹہرے میں حاضر ہو کر پیش کرے۔ وگرنہ اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو ہمارے یہاں عموماً مجرموں کے ساتھ نہیں ہوتا۔

اور سب سے آخر میں میری اہل لندن سے بھی گزارش ہے کہ یہ شخص بھگوڑا ہے اور بڑا خطرناک ادبی مجرم بھی۔ اتنا جینئس ہے کہ اس سے ہر وقت کسی بھی انہونی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس نے ادب میں بڑے بڑے سنگین و رنگین جرم کئے ہیں۔ اس کے لگائے ہوئے ادبی گھاؤ آج تک ہمارا اردو ادب مندمل نہیں کرسکا۔ اب یہ ایک مدت (تیرہ، چودہ سال) سے خاموش ہے۔ اس کی یہ طویل خاموشی کسی بھی بہت بڑے ادبی طوفان کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ مبادا کل کلاں کو یہ شخص آپ کی مادری زبان میں کوئی ایسی "شرارت" (جس کی یہ بھرپور استطاعت رکھتا ہے) کر بیٹھے کہ آپ کا سارا انگریزی ادب شرمندہ ہوا پھرے۔ اس سے پہلے ہی اسے تاحال کچھ نہ کرنے کا زبردستی پیشگی ایوارڈ دے کر جلد از جلد ملک سے نکال دیا جائے۔ **

(یہ مضمون "آب گم" کی اشاعت سے قبل تحریر کیا گیا)۔

پرویز ید اللہ مہدی

بابائے ظرافت۔ مشتاق احمد یوسفی (خاکہ نما مضمون)

کچھ عرصہ پہلے فلم فیر ایوارڈ کی ایک رنگارنگ تقریب میں مشہور اسکرپٹ رائیٹر نغمہ نگار جاوید اختر سے کسی صحافی نے انٹرویو کے دوران جب یہ سوال کیا کہ آپ نے بے شمار ہٹ فلمیں لکھی ہیں جن میں بالی وڈ کے تقریباً سارے ہی نامور اداکاروں سپر اسٹاروں نے کام کیا ہے ان میں سے اپنے کسی تین پسندیدہ ہیروز کے نام بتائیے۔؟

تو سوال سنتے ہی جاوید نے ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر جواب دیا۔ "میرے تین پسندیدہ ہیروز ہیں دلیپ کمار، دلیپ کمار اور دلیپ کمار۔۔۔!

ہو بہو ایسا ہی سوال ادب کے حوالے سے اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ عہد حاضر کے اپنے تین پسندیدہ زندہ مزاح نگاروں کے نام بتلائیے تو میرا جواب ہوگا۔ مشتاق احمد یوسفی، مشتاق احمد یوسفی اور مشتاق احمد یوسفی۔۔۔!!!

دلیپ کمار اور مشتاق احمد یوسفی کے مابین یوں بھی کئی مماثلتیں ہیں جیسے دلیپ کمار ایک ذہین اور فطری اداکار ہیں تو یوسفی صاحب ایک ذہین اور فطری ظرافت نگار۔ دلیپ کمار عوام کے علاوہ خود فلمی ستاروں کے پسندیدہ اداکار ہیں تو یوسفی صاحب ادب ذوق قارئین کے علاوہ ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کے پسندیدہ ادیب ہیں۔ دلیپ کمار فن اداکاری میں حرف آخر ہیں تو یوسفی صاحب ظرافت نگاری کے فن میں حرف آخر دلیپ کمار اصلیت میں یوسف خاں ہیں تو مشتاق احمد بھی یوسفی ہیں۔ غرض یہ کہ دلیپ کمار ہیرو ہیں تو مشتاق احمد یوسفی ہیرا ایک ایسا ہیرا جسکی چمک دمک سے اردو طنز و مزاح کا ایوان روشن ہے۔ خیرہ ہے۔ ان کی تا حال شائع شدہ چار عدد تصانیف کے آگے دوسری تمام زبانوں کے طنز و مزاح کا ذخیرہ اونٹ کے منہ میں زیرہ ہے۔

یوسفی صاحب سے میرا غائبانہ تعارف بھی کچا پکا ہی تھا کہ ایک نئے رنگروٹ کی حیثیت سے ظرافت نگاروں کی اس فوج میں میری بھی بھرتی ہو گئی جس کے یوسفی صاحب کا قافلہ سالار تھے اور یوں ان سے میری غائبانہ وابستگی اور مضبوط ہو گئی۔ ان دنوں بد قسمتی سے ہند و پاک کے بیچ 65ء کی جنگ کو ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا دونوں ملکوں کے سفارتی تعلقات میں سرد مہری آچکی تھی نتیجتاً دونوں طرف سے رسالوں اور اخباروں کی آمدورفت کا سلسلہ قریب قریب ختم ہو چکا تھا، کچھ عرصہ ایسے ہی بے کیف گزرا پھر یار لوگوں نے کتب و رسائل کی ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر منتقلی کا نیا راستہ ڈھونڈ نکالا، خلیجی ریاستوں کے ذریعہ سونے کے ساتھ کتابیں اور رسالے بھی اسمگل ہونے لگے جس کے نتیجے میں یوسفی صاحب کی تحریریں ہندوستان کے رسالوں میں ڈائجسٹ ہونے لگیں۔ ان کی کتابوں کے چور ایڈیشن بھی دھڑلے سے شائع ہونے لگے بلکہ ان چور ایڈیشنوں کے بھی چور ایڈیشن شائع ہونے لگے یعنی دلی کا کوئی پبلشر یوسفی صاحب کی کتاب کا چور ایڈیشن شائع کرتا تو جواب میں حیدرآباد دکن کا کوئی پبلشر اس چور ایڈیشن کا چور ایڈیشن شائع کر دیتا یوں چور پر مور پڑنے والا محاورہ ان چور ایڈیشنوں پر پوری طرح صادق آتا۔ اسی طرح کے چور ایڈیشن جابجا ادھر ادھر بھی شائع ہوتے رہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے جس سے چوروں عرف پبلشروں کے تو وارے نیارے ہو رہے ہیں لیکن ادیب و شاعر غریب اسی طرح

گردش کے مارے ہوئے ہیں بہ الفاظ دیگر چور پبلشروں کی پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہے اور مصنف بے چارہ کڑھائی سے نیچے دبا اپنے لکھے کی رائلٹی وصولنے کی جگہ پنالٹی ادا کر رہا ہے۔ سچ ہے برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر یا اردو کے مصنفوں پر۔

اور لکھاڑی لفظوں کی مدد سے مضامین تحریر کرتے ہیں۔ یوسفی صاحب لفظوں سے شیش محل تعمیر کرتے ہیں چنانچہ ان کے مضامین کا ہر فقرہ چست ہر جملہ نپا تلا۔ ہر لفظ اپنی جگہ انگوٹھی میں نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہوتا ہے۔ مرزا غالب نے اپنے اشعار میں استعمال ہونے والے ہر لفظ کو گنجینۂ معنی کے طلسم سے تعبیر کیا تھا۔ یوسفی صاحب، غالب کے بعد غالباً دوسرے قلم کار ہیں جن کے لفظوں کے انتخاب پر غالب کا وہ شعر اسطرح صادق آتا ہے

گنجینۂ معنی کا طلسم اسے کہیئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

یہی وجہ ہے کہ یوسفی صاحب کی تحریروں میں موتی کی طرح چمکنے والے کسی لفظ کو ہٹانا ویسے ہی ناممکن ہے جیسے کہ امریکی حکمرانوں کے لئے عراق کے ایوان صدارت سے صدر صدام حسین کو ہٹانا۔ چنانچہ اس کوشش میں سابق صدر امریکہ جارج بش خود صدارت سے ہاتھ دھو بیٹھے اور یہی حسرت ناتمام لیے موجودہ صدر بل کلنٹن اپنے تمام تر اثر رسوخ اور معاشقوں کے باوجود مسلسل ناکامی سے دوچار ہیں بلکہ اب تو خود ان کا وہائٹ ہاؤز سے چل چلاؤ قریب ہے۔ دراصل یوسفی صاحب لفظ کی حرمت اور اس کی معنویت کی تہہ داری سے پوری طرح واقف ہیں۔ وہ لفظ شناس بھی ہیں رمز شناس بھی تب ہی تو ان کی ہر تحریر میں گہرائی و گیرائی کیساتھ ایک طرف اگر فلسفہ تہذیب تمدن، تاریخ، جغرافیہ، جمادات، نباتات، حیوانات، کیمیا، طبعیات، حیاتیات، معدنیات سماجیات، سیاسیات، شہریات، ریاضیات، معاشیات، اقتصادیات، لسانیات، جنسیات دینیات، اخلاقیات، عمرانیات، فلکیات، عملیات جیسے جناتی موضوعات پر تبصرے، تجزیے، تذکرے ملتے ہیں تو دوسری طرف ذہانت، فطانت، سلاست بلاغت حلاوت لطافت شرارت چھیڑ شوخی، چٹکی بر جستگی، بذلہ سنجی، حاضر جوابی کے سینکڑوں نمونے بھی جادو جگاتے دکھائی دیتے ہیں لیکن اس سے بخدا یوسفی صاحب کا مقصد نہ تو اپنی علمیت کی دھونس جمانا ہے اور نہ اپنے علم کے بوجھ تلے قاری کو اسطرح دبانا ہے کہ بے چارہ اف تک نہ کر سکے بالکل اسی طرح جس طرح خوشحال ملکوں کی مالی امداد پر پلنے والے پسماندہ ملک اپنے ان داتاؤں کی شر پسندیوں اور زبردستیوں پر اف تک نہیں کرتے ۔۔۔ دھونس، دھمکی، اثر رسوخ، سفارش سے خود ساختہ ونام نہاد نقادوں کو تو خریدا جاسکتا ہے۔ سمجھدار قاری کو نہیں۔ اور یوسفی صاحب اپنے قاری کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ انہیں پتہ ہے کہ ان کے پڑھنے والوں میں بھانت بھانت کے موضوعات کو پسند کرنے والے قارئین شامل ہیں۔ لہٰذا یہ ادبی، سماجی، سیاسی، قیاسی ہر نوع کے موضوعات کا احاطہ کر کے سمندر کو کوزے میں سمو کر قاری کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں تاکہ اسے اپنی پسند کے موضوع کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنا نہ پڑے اس طرح یہ اپنے قاری کا وقت اور پیسہ دونوں بچاتے ہیں۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ادیب و فنکار بڑا ہوتا ہے تو آدمی بڑا نہیں ہوتا۔ آدمی بڑا ہوتا ہے تو اپنے اور منصب کے اعتبار سے بڑا نہیں ہوتا کیونکہ عموماً ایک بڑائی دوسری بڑائی کو کھا جاتی ہے ادیب بھی بڑا ہو، آدمی بھی بڑا ہو اس کا رتبہ و عہدہ بھی بڑا ہو ان تینوں بڑائیوں کی یکجائی مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ اس کے لیے آدمی کے ظرف کا بڑا ہونا ضروری ہے ہی اس سے بڑھ کر اس کا کرم شامل حال ہونا ضروری ہے۔ جو سب سے بڑا ہے۔ ساری بڑائی جس کی یکتائی پر ختم ہے اور اس خالق یکتا کے کرم کا مستحق بننے کے لیے بے لوث خدمت خلق ضروری ہے اور یوسفی صاحب کی تحریر میں نسل انسانی کے تئیں خلوص و ہمدردی کی بے شمار جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں تب

ہی تو یہ جتنے بڑے ادیب ہیں، آدمی بھی اتنے ہی بڑے ہیں اور عہدیدار بھی اتنے ہی بڑے رہے ہیں۔ چنانچہ لندن جیسے عالم میں انتخاب شہر میں عرصے تک اپنی عہدیدارانہ شان کے جلوے دکھاتے رہے ہیں۔ اس زمانے میں بقول چند راویان خوش بیان، برصغیر سے جو بھی ادیب شاعر فنکار ادب کا پرستار عازم لندن ہوتا اس کے دل میں ایک طرف اگر شاہی محل اور ملکہ ایلزبتھ کی کم از کم ایک جھلک دیکھنے کی خواہش انگڑائیاں لیتی تو دوسری طرف یوسفی صاحب کے دیدار کی تمنا بھی موجزن ہوتی۔ سچ ہے قدرت کے کھیل بھی نرالے ہیں کبھی جس ملکہ کے آباد اجداد نے برصغیر ہند و پاک کے عوام کو برسوں اپنا غلام بنائے رکھا تھا اسی بستی کا ایک باسی نام جس کا یوسفی مقام و مرتبہ میں ملکہ کے برابر پہنچ گیا۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کبھی کے دن بڑے تو کبھی کی رات...!

مدتوں یوسفی صاحب سے ان کی تحریروں کے ذریعہ غائبانہ وابستگی کے باوجود کبھی ان سے بہ نفس نفیس ملنے انہیں بہ قلم خود دیکھنے، بہ زبان خود کچھ سننے سنانے کا موقع نہیں ملا۔ جی بہت چاہتا تھا لیکن ان سے ملنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ لہذا دل میں اکثر یہ خواہش جاگا کرتی کہ وہ نہ سہی اس کی تصویر ہی سہی۔ اگرچہ تصویر چاہے کسی خان یا خاناں کی ہو یا جان جاناں کی، تصویر تصویر ہوتی ہے۔ نہ بات کرسکتی ہے اور نہ سن سکتی ہے۔ اس لئے دل نہیں بہلا سکتی لیکن جب اصل نہ ملے تو آدمی کو عکس پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ میں نے ان کی تصویر کی تلاش شروع کردی تو پتہ چلا کہ یوسفی صاحب بے پردگی کے خوف سے تصویر کھنچوانے سے حتی الممکنہ احتراز کرتے ہیں کہ اس طرح ان کی تصویر کو نامحرم خواتین کے ہاتھوں میں نہ پہنچنے سے کسی طرح روکا نہیں جاسکتا۔ ایسا نہیں کہ اتنے لمبے عرصے کے دوران ان سے بہ نفس نفیس ملنے کے اسباب بنے ہی نہیں کم از کم دو بار دیدار یوسفی کے آثار نظر آئے۔ پہلی مرتبہ زندہ دلان حیدر آباد دکن کے زیر اہتمام منعقدہ عالمی مزاح کانفرنس میں ان کے آنے کے چرچے تھے لیکن چند ناگزیر وجوہات کے سبب یہ نہیں آسکے۔ پھر دوسری مرتبہ حالیہ عرصہ میں زندہ دلان ہی کی سالانہ تقاریب میں شرکت کیلئے یہ راضی ہوگئے تاریخیں تک طے ہوگئیں کہ اچانک کارگل کا بحران اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ ان دونوں ملکوں کی بدنصیبی ہے کہ جب بھی یہ قریب آنے کو ہوتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی کارگل اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ البتہ اس بیچ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ حالات مجھے امریکہ لے آئے اور میرے آنے کے کچھ عرصہ بعد یوسفی صاحب کے امریکہ تشریف لانے کی خوشخبری ملی۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ قدرت مجھے امریکہ محض اس لئے لے آئی تاکہ میں یوسفی صاحب کا دیدار کرسکوں۔ میرا خیال ہے یوسفی صاحب بھی شائد مجھ سے ملنے کے لئے ہی یہاں تشریف لائے ہیں۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے میرے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہے۔ چند ماہ قبل میرے ایک بزرگ دوست اور ساتھی مزاح نگار جناب طالب حسین زیدی حیدر آباد سے کراچی تشریف لے گئے تھے۔ ان کے اس دورے میں پاکستان کے اور ادیبوں و شاعروں کے ساتھ یوسفی صاحب سے بھی ملنے کا پروگرام تھا چنانچہ جاتے ہوئے جب انہوں نے خاص طور سے مجھ سے پوچھا کہ پاکستان میں کسی کے لیے آپ کا کوئی خصوصی پیغام... تو میں نے برجستہ کہا تھا۔

میرا سلام کہیو اگر یوسفی ملیں

برادرم زیدی صاحب نے اپنا وعدہ نبھایا، میرا سلام یوسفی صاحب تک پہنچایا اور یوسفی صاحب چونکہ کسی کا ادھار زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رکھتے وہ چاہے سلام ہو کلام ہو یا پیام ہو، مہر سعجل کی طرح بعجلت ممکنہ ادا کردیتے ہیں چنانچہ امریکہ آکر ادبی محفلوں میں شرکت فرمانا محض ایک بہانہ ہے۔ اصل میں یوسفی صاحب یہاں میرے سلام کے جواب میں بہ نفس نفیس بہ زبان خود وعلیکم السلام کہنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔

یوسفی صاحب کے حوالے سے آخر میں یہ عرض کرتا چلوں کہ بڑی شخصیتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تاریخ میں جگہ پانے کے

لیے مورخ کی محتاج ہوتی ہیں اور دوسری اپنی تاریخ خود رقم کرتی ہیں۔ یوسفی صاحب کا شمار دوسری قسم کی شخصیات میں ہوتا ہے۔ چنانچہ چراغ تلے طنز و مزاح کے چراغ روشن کرکے خاکم بدہن اپنی تاریخ زرگزشت کی صورت لکھ کر یوسفی صاحب نے آب گم کو پالیا ہے۔ اردو کے نامور شاعر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے ادب میں اپنے مقام و مرتبہ کا خود اس طرح تعین فرمایا تھا کہ آنے والی نسلیں ان لوگوں پر رشک کریں گی جنھوں نے فراق کو چلتے پھرتے، سانس لیتے، شعر سناتے ہوئے دیکھا تھا۔ فراق کا وہی شعر ذرا سے تصرف کیساتھ بابائے ظرافت یوسفی صاحب کی نذر کرتے ہوئے کہ وہ اگر فراق تھے تو یہ مشتاق ہیں تذکرہ یوسفی کو تمام کرتا ہوں۔

آنے والی نسلیں ہم پہ رشک کریں گی اے لوگو
ان کو جب معلوم یہ ہوگا ہم نے مشتاق کو دیکھا تھا

(نوٹ: جون ۲۰۰۰ء شمالی امریکہ کے شہر شکاگو میں منعقدہ مشتاق احمد یوسفی کے ساتھ ایک شام کے موقع پر یوسفی صاحب کی بہ نفس نفیس موجودگی پر پڑھے اور پسند کیے گیے خاکے سے اقتباس)۔

مشتاق احمد یوسفی

پہلا پتھر

(چراغ تلے کا مقدمہ)

مقدمہ نگاری کی پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی پڑھا لکھا ہو۔ اسی لئے بڑے بڑے مصنف بھاری رقمیں دے کر اپنی کتابوں پر پروفیسروں اور پولیس سے مقدمے لکھواتے اور چلواتے ہیں۔ اور حسب منشا بدنامی کے ساتھ بری ہوتے ہیں۔ فاضل مقدمہ نگار کا ایک پیغمبرانہ فرض یہ بھی ہے کہ وہ دلائل و نظائر سے ثابت کردے کہ اس کتاب مستطاب کے طلوع ہونے سے قبل، ادب کا نقشہ مسدس حالی کے عرب جیسا تھا۔

"ادب" جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا
جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا

اس میں شک نہیں کہ کوئی کتاب بغیر مقدمہ کے شہرت عام اور بقائے دوام حاصل نہیں کر سکتی۔ بلکہ بعض معرکتہ الآرا کتابیں تو سراسر مقدمے ہی کی چاٹ میں لکھی گئی ہیں۔ برنارڈشا کے ڈرامے (جو درحقیقت اس کے مقدموں کے ضمیمے ہیں) اسی ذیل میں آتے ہیں۔ اور دور کیوں جائیں۔ خود ہمارے ہاں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں جو محض آخر میں دعا مانگنے کے لالچ میں نہ صرف یہ کہ پوری نماز پڑھ لیتے ہیں بلکہ عبادت میں خشوع و خضوع اور گلے میں رندھی رندھی کیفیت پیدا کرنے کے لئے اپنی مالی مشکلات کو حاضر و ناظر جانتے ہیں۔ لیکن چند کتابیں ایسی بھی ہیں جو مقدمہ کو جنم دے کر خود دم توڑ دیتی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر جانسن کی ڈکشنری، جس کا صرف مقدمہ باقی رہ گیا ہے۔ اور کچھ ایسے مصنف بھی گزرے ہیں جو مقدمہ لکھ کر قلم توڑ دیتے ہیں۔ اور اصل کتاب کی ہوا تک نہیں دیتے۔ جیسے شعرو شاعری پر مولانا حالی کا بھرپور مقدمہ جس کے بعد کسی کو شعروشاعری کی تاب و تمنا ہی نہ رہی۔ بقول مرزا عبدالودود بیگ۔ اس کتاب میں سے مقدمہ نکال دیا جائے تو صرف سرورق باقی رہ جاتا ہے۔

تاہم اپنا مقدمہ بقلم خود لکھنا کار ثواب ہے کہ اس طرح دوسرے جھوٹ بولنے سے بچ جاتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ کہ آدمی کتاب پڑھ کر قلم اٹھاتا ہے۔ ورنہ ہمارے نقاد عام طور پر کسی تحریر کو اس وقت تک غور سے نہیں پڑھتے جب تک انھیں اس پر سرقہ کا شبہ نہ ہو۔

پھر اس بہانے اپنے متعلق چند ایسے نجی سوالات کا دنداں شکن جواب دیا جاسکتا ہے جو ہمارے ہاں صرف چالان اور چہلم کے موقع پر پوچھے جاتے ہیں مثلاً:

کیا تاریخ پیدائش وہی ہے جو میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں درج ہے؟ حلیہ کیا ہے؟ مرحوم نے اپنے "بینک بیلنس" کے لئے کتنی بیویاں چھوڑی ہیں؟ بزرگ افغانستان کے راستے سے شجرہ نسب میں کب داخل ہوئے؟ نیز موصوف اپنے خاندان سے شرماتے ہیں یا خاندان ان سے شرماتا ہے؟ راوی نے کہیں آزاد کی طرح جوش عقیدت میں ممدوح کے جدامجد کے کانپتے ہوئے ہاتھ سے استرا چھین کر تلوار تو نہیں تھمادی؟

چنانچہ اس موقع سے جائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا مختصر ساخاکہ پیش کرتا ہوں۔

نام۔ سرورق پر ملاحظہ فرمائیے۔

خاندان۔ سو پشت سے پیشہ آبا سپہ گری کے علاوہ سب کچھ رہا ہے۔

تاریخ پیدائش۔ عمر کی اس منزل پر آپہنچا ہوں کہ اگر کوئی سنہ ولادت پوچھ بیٹھے تو اسے فون نمبر بتا کر باتوں میں لگالیتا ہوں۔

اور یہ منزل بھی عجیب ہے۔ بقول صاحب "کشکول" ایک وقت تھا کہ ہمارا تعارف بہو بیٹی قسم کی خواتین سے اس طرح کرایا تھا کہ فلاں کے بیٹے ہیں۔ فلاں کے بھانجے ہیں۔ اور اب یہ زمانہ آگیا ہے کہ فلاں کے باپ ہیں اور فلاں کے ماموں؛ اور ابھی کیا گیا ہے۔ عمر رسیدہ پیش رو زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ اس کے آگے مقامات آہ وفغاں اور بھی ہیں۔

پیشہ۔ گو کہ یونیورسٹی کے امتحانوں میں اول آیا، لیکن اسکول میں حساب سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی۔ اور حساب میں فیل ہونے کو ایک عرصے تک اپنے مسلمان ہونے کی آسمانی دلیل سمجھتا رہا۔

اب وہی ذریعہ معاش ہے؛ حساب کتاب میں اصولاً دو اور دو چار کا قائل ہوں، مگر تاجروں کی دل سے عزت کرتا ہوں کہ وہ بڑی خوش اسلوبی سے دو اور دو کو پانچ کر لیتے ہیں۔

پہچان۔ قد۔ پانچ فٹ ساڑھے چھ انچ (جوتے پہن کر)

وزن۔ اوور کوٹ پہن کر بھی دبلا دکھائی دیتا ہوں۔ عرصے سے مثالی صحت رکھتا ہوں۔ اس لحاظ سے کہ جب لوگوں کو کراچی کی آب و ہوا کو برا ثابت کرنا مقصود ہو تو اتمام حجت کے لئے میری مثال دیتے ہیں۔

جسامت۔ یوں سانس روک لوں تو ۳۸ انچ کا بنیان بھی پہن سکتا ہوں۔ بڑے لڑکے کے جوتے کا نمبر ۷ ہے جو میرے بھی فٹ آتا ہے۔

حلیہ۔ اپنے آپ پر پڑا ہوں۔

پیشانی اور سر کی حد فاصل اڑ چکی ہے۔ لہذا منہ دھوتے وقت یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں۔ ناک میں بذاتہ قطعی کوئی نقص نہیں ہے۔ مگر بعض دوستوں کا خیال ہے کہ بہت چھوٹے چہرے پر لگی ہوئی ہے۔

پسند۔ غالب، ہاکس بے، بھنڈی۔

پھولوں میں، رنگ کے لحاظ سے، سفید گلاب اور خوشبوؤں میں نئے کرنسی نوٹ کی خوشبو بہت مرغوب ہے۔ میرا خیال ہے کہ سبز سبز تازہ تازہ اور کرارے کرنسی نوٹوں کا عطر نکال کر ملازمت پیشہ حضرات اور ان کی بیویوں کو مہینے کی آخری تاریخوں میں سنگھایا جائے تو گرہستی زندگی جنت کا نمونہ بن جائے۔

پالتو جانوروں میں کتوں سے پیار ہے۔ پہلا کتا چوکیداری کے لئے پالا تھا۔ اسے کوئی چرا کر لے گیا۔ اب محض بربنائے وضع داری پالتا ہوں کہ انسان کتے کا بہترین رفیق ہے۔

بعض تنگ نظر اعتراض کرتے ہیں مسلمان کتوں سے بلاوجہ چڑتے ہیں۔ حالانکہ اس کی ایک نہایت معقول اور منطقی وجہ موجود ہے۔ مسلمان ہمیشہ سے ایک عملی قوم رہے ہیں۔ اور وہ کسی ایسے جانور کو محبت سے نہیں پالتے جسے ذبح کر کے کھا نہ سکیں۔ گانے سے بھی عشق ہے۔ اسی وجہ سے ریڈیو نہیں سنتا۔

چڑ۔ جذباتی مرد، غیر جذباتی عورتیں، مٹھاس، شطرنج۔

مشاغل۔ فوٹو گرافی، لکھنا پڑھنا۔

تصانیف۔ چند تصویر بتاں، چند مضامین و خطوط۔

کیوں لکھتا ہوں۔ ڈزریلی نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ جب میرا جی عمدہ تحریر پڑھنے کو چاہتا ہے تو ایک کتاب لکھ ڈالتا ہوں۔ رہا یہ سوال کہ یہ کھٹ مٹھے مضامین طنزیہ ہیں یا مزاحیہ یا اس سے بھی ایک قدم آگے۔ یعنی صرف مضامین۔ تو یہاں صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ وار ذرا اوچھا پڑے، یا بس ایک روایتی آنچ کی کسر رہ جائے تو لوگ اسے بالعموم طنز سے تعبیر کرتے ہیں۔ ورنہ مزاح

ہاتھ آئے تو بت، ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے

اور جہاں یہ صورت ہو تو خام فن کار کے لئے طنز ایک مقدس جھنجلاہٹ کا اظہار بن کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ہر وہ لکھنے والا جو سماجی اور معاشی ناہمواریوں کو دیکھتے ہی دماغی باؤ ٹے میں مبتلا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، خود کو طنز نگار کہنے اور کہلانے کا سزاوار سمجھتا ہے۔ لیکن سادہ و پرکار طنز ہے بڑی جان جوکھوں کا کام۔ بڑے بڑوں کے جی چھوٹ جاتے ہیں۔ اچھے طنز نگار تنے ہوئے رسے پر اترا اترا کر کرتب نہیں دکھاتے بلکہ

رقص یہ لوگ کیا کرتے ہیں تلواروں پر

اور اگر ژاں پال سارتر کی مانند "دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بیباک" ہو تو جنم جنم کی یہ جھنجلاہٹ آخر کار ہر بڑی چیز کو چھوٹی کر دکھانے کا ہنر بن جاتی ہے۔ لیکن یہی زہر غم جب رگ و پے میں سرایت کر کے لہو کو کچھ اور تیز و تند و توانا کر دے تو نس نس سے مزاح کے شرارے پھوٹنے لگتے ہیں۔ عمل مزاح اپنے لہو کی آگ میں تپ کر نکھرنے کا نام ہے۔ لکڑی جل کر کوئلہ بن جاتی ہے۔ اور کوئلہ راکھ۔ لیکن اگر کوئلے کے اندر کی آگ باہر کی آگ سے تیز ہو تو پھر وہ راکھ نہیں بنتا ہیرا بن جاتا ہے۔

مجھے احساس ہے کہ اس ننھے سے چراغ سے نہ کوئی الاؤ بھڑک سکا اور نہ کوئی چتا دکی۔

میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اپنی چاک دامنی پر جب اور جہاں ہنسنے کو جی چاہا ہنس دیا۔ اور اب اگر آپ کو بھی اس ہنسی میں شامل کر لیا تو اس کو اپنی خوش قسمتی تصور کروں گا۔ میرا یہ دعوی نہیں کہ ہنسنے سے سفید بال کالے ہو جاتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ پھر وہ اتنے برے نہیں معلوم ہوتے۔ بالفعل، اس سے بھی غرض نہیں کہ اس خندہ مکرر سے میرے سوا کسی اور کی اصلاح بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ ہنسنے کی آزادی فی نفسہ تقریر کی آزادی سے کہیں زیادہ مقدم و مقدس ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ جو قوم اپنے آپ پر جی کھول کر ہنس سکتی ہے وہ کبھی غلام نہیں ہو سکتی۔

یقین کیجئے، اس سے اپنے علاوہ کسی اور کی اصلاح و فہمائش مقصود ہو تو روسیاہ۔ کارلائل نے دوسروں کی اصلاح سے غلو رکھنے والوں کو بہت اچھی نصیحت کی تھی کہ "بڑا کام یہ ہے کہ آدمی اپنی ہی اصلاح کر لے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ دنیا سے کم از کم ایک بدمعاش تو کم ہوا۔" میری رائے میں (جو ضروری نہیں کہ ناقص ہی ہو) جس شخص کو پہلا پتھر پھینکتے وقت اپنا سر یاد نہیں رہتا، اسے دوسروں پر پتھر پھینکنے کا حق نہیں۔

مخدومی و مکرمی جناب شاہد احمد دہلوی کا تہ دل سے سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے یہ مضامین، جو اس سے پہلے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے تھے، پڑھوا کر بکمال توجہ سنے۔ اور نہ صرف اپنی گمبھیر چپ سے کمزور حصوں کی نشاندہی کی، بلکہ جو لطیفے بطور خاص پسند آئے ان پر گھر جا کر بہ نظر حوصلہ افزائی ہنسے بھی۔ اگر اس کے باوجود وہ زبان و بیان کی لغزشوں سے پاک نہیں ہوئے (اشارہ مضامین کی طرف

ہے) تو اس میں ان کا قصور نہیں ۔ یوں بھی میں قبلہ شاہد احمد صاحب کی باوقار سنجیدگی کا اس درجہ احترام کرتا ہوں کہ جب وہ اپنا لطیفہ سنا چکتے ہیں تو احتراماً نہیں ہنستا ۔ لیکن ایک دن یہ دیکھ کر کہ میرا ایک مضمون پڑھ کے " الٹی ہنسی " (جس میں ، بقول ان کے ، آواز حلق سے باہر نکلنے کے بجائے الٹی اندر جاتی ہے) ہنس رہے ہیں ، میں خوشی سے پھولا نہ سمایا ۔

پوچھا ۔ " دلچسپ ہے ؟ "

فرمایا ۔ " جی ! تذکیر و تانیث پر ہنس رہا ہوں ! " پھر کہنے لگے ۔ " حضرت ! آپ پنگ پانگ کو مؤنث اور فٹ بال کو مذکر لکھتے ہیں ! " میں نے کھسیانے ہو کر جھٹ اپنی پنسل سے فٹ بال کو مؤنث اور پنگ پانگ کو مذکر بنا دیا تو منہ پھیر پھیر کر " سیدھی " ہنسی ہنسنے لگے ۔

دوستوں کا حساب گو دل میں ہوتا ہے ، لیکن رسماً بھی اپنی اہلیہ ادریس فاطمہ کا شکریہ ضروری ہے کہ

" خطا " شناس من است و منم زباں دانش

ان مضامین میں جو غلطیاں آپ کو نظر نہیں آتیں ، اور وہ جواب بھی نظر آ رہی ہیں ، ان کا سہرا بالترتیب ان کے اور میرے سر ہے ۔ اس سے پہلے وہ میرے مطبوعہ مضامین میں کتابت کی غلطیاں کچھ اس انداز سے نکالتی تھیں گویا لیتھو میں نے ہی ایجاد کیا ہے ۔ یہ واقعہ ہے کہ اس کتاب کو آفسیٹ پر چھپوانے میں مکتبہ جدید کی ترغیب و تحریص سے زیادہ ان کے طعن و تعریض کو دخل ہے ۔

رخصت ہونے سے قبل مرزا عبدالودود بیگ کا تعارف کراتا جاؤں ۔ یہ میرا ہمزاد ہے ۔ دعا ہے خدا اس کی عمر و اقبال میں ترقی دے ۔ ☆

کراچی
۵ ۔ فروری ۱۹۶۱ء

مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی

صنف لاغر

سنتے چلے آئے ہیں کہ آم، گلاب اور سانپ کی طرح عورتوں کی بھی بے شمار قسمیں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آم اور گلاب کی قسم کا صحیح اندازہ کاٹنے اور سونگھنے کے بعد ہوتا ہے۔ اور اگر مار گزیدہ مرجائے تو سانپ کی قسم کا پتہ چلانا بھی چنداں دشوار نہیں۔ لیکن آخر الذکر، خالص مشک کی طرح، اپنی قسم کا خود اعلان کردیتی ہیں۔ ایک بزرگوار، جنھوں نے اپنی عمر اور کمائی ریس کورس اور "طواف کوئے ملامت" میں گنوائی ہے، اکثر کہا کرتے ہیں کہ گھوڑے اور عورت کی ذات کا اندازہ اس کی لات اور بات سے کیا جاتا ہے۔ لیکن اس قسم کے مقولوں کی حیثیت ہارے ہوئے جواری کی لفظی پھلجھڑیوں سے زیادہ نہیں، جو فضا کو روشن کریں یا نہ کریں، آنکھوں میں کچھ دیر کے لیے ضرور چکا چوند پیدا کردیتی ہیں۔ پھر اس کے بعد تاریکی کچھ اور زیادہ تاریک معلوم ہوتی ہے۔ گھوڑے اور سانپ کے خصائل کی تصدیق یا تردید کا حق ویسے تو سلوتریوں اور سپیروں کو پہنچتا ہے یا پھر ان حضرات کو جو ڈسے جا چکے ہیں یا دلتی کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں لیکن ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ ثمرہ ممنوعہ اگر سانپ کے پھن پر بھی رکھا ہوتا تو وہاں بھی آدم کے حریص ہونٹ بے دھڑک اسے چوم لیتے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بات قسموں کی ہو رہی تھی اور ہم کہنا چاہتے تھے کہ آجکل عورتوں کو دو قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے ۔۔۔۔ ایک وہ جو موٹی ہیں۔ دوسرے وہ جو دبلی نہیں ہیں۔ آپ کہیں گے "آخر ان دونوں میں فرق کیا ہوا؟ یہ تو وہی الف دو زبر 'اً' اور الف نون زبر 'اَن' والی بات ہوئی"۔ مگر آپ یقین جانئیے کہ دونوں قسموں میں دبلے ہونے کی خواہش کے علاوہ اور کوئی بات مشترک نہیں۔ ان کے حدود اربعہ، خط و خال اور نقوش جدا جدا ہیں اور اس میں کاتب تقدیر کی کسی املا کی غلطی کا قطعاً کوئی شائبہ نہیں۔ اصل فرق یہ ہے کہ اول الذکر طبقہ (جو صحیح معنوں میں ایک فرقہ کی حیثیت رکھتا ہے) کھانے کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ دوسرا طبقہ زندہ رہنے کے لیے کھاتا ہے۔ پہلا طبقہ دوا کو بھی غذا سمجھ کر کھاتا ہے اور دوسرا طبقہ غذا کو بھی بقدر دوا استعمال کرتا ہے۔ ایک کھانے پر جان دیتا ہے اور دوسرا کھانے کو دوڑتا ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ فرق باریک ضرور ہے، لیکن اگر آپ نے کبھی فن برائے فن، زندگی برائے فن، فن برائے زندگی اور زندگی برائے بندگی وغیرہ کی بحث سنی ہے تو یہ فرق بخوبی سمجھ میں آجائے گا۔ اس مضمون میں روئے سخن دوسرے طبقہ سے ہے جو دبلا نہیں ہے، مگر ہونا چاہتا ہے

زمانہ قدیم میں ایران میں نسوانی حسن کا معیار چالیس صفات تھیں (اگرچہ ایک عورت میں ان کا یکجا ہونا ہمیشہ نقض امن کا باعث ہوا) اور یہ مشہور ہے کہ شیریں ان میں سے انتالیس صفات رکھتی تھی۔ چالیسویں صفت کے بارے میں مورخین متفقہ طور پر خاموش ہیں۔ لہٰذا گمان غالب ہے کہ اس کا تعلق چال چلن سے ہوگا۔ اس زمانے میں ایک عورت میں عموماً ایک ہی صفت پائی جاتی تھی۔ اس لیے بعض بادشاہوں کو بدوجہ مجبوری اپنے حرم میں عورتوں کی تعداد بڑھانا پڑی۔ ہر زمانے میں یہ صفات زنانہ لباس کی طرح

سکڑتی، سمٹتی اور گھٹتی رہیں۔ بالآخر صفات تو غائب ہوگئیں، صرف ذات باقی رہ گئی۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ کیونکہ ذات و صفات کی بحث سے قطع نظر، یہی کیا کم ہے کہ عورت صرف عورت ہے۔ ورنہ وہ بھی مرد ہو جاتی تو ہم اس کا کیا بگاڑ لیتے؟

آج کل کھاتے پیتے گھرانوں میں دبلے ہونے کی خواہش ہی ایک ایسی صفت ہے جو سب خوب صورت لڑکیوں میں مشترک ہے۔ اس خواہش کی محرک دور جدید کی ایک جمالیاتی دریافت ہے۔ جس نے تندرستی کو ایک مرض قرار دے کر بدصورتی اور بدہیئتی سے تعبیر کیا۔ مردوں کی اتنی بڑی اکثریت کو اس رائے سے اتفاق ہے کہ اس کی صحت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ جہاں یرقان حسن کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہو جائے اور چشم بیمار و تن لاغر حسن کا معیار بن جائیں، وہاں لڑکیاں اپنے تندرست و توانا جسم سے شرمانے اور بدن چرا کر چلنے لگیں تو تعجب نہیں ہونا چاہئیے۔ یوں سمجھئے کہ حوا کی جیت کا راز آدم کی کمزوری میں نہیں بلکہ خود اس کی اپنی کمزوری میں مضمر ہے۔ اگر آپ کو یہ نچڑے ہوئے دھان پان بدن، ستے ہوئے چہرے اور سوکھی بانہیں پسند نہیں تو آپ یقیناً ڈاکٹر ہوں گے۔ ورنہ اہل نظر تو اب چہرے کی شادابی کو ورم، فربہی کو جلندھر اور پنڈلی کے سڈول پن کو "فیل پا" گردانتے ہیں!

آج بھی فرہاد کے ہاتھ میں تیشہ ہے مگر یہ تیشہ محمود ہے! یا یوں کہیے کہ جب سے بت شکن نے بت پرستی اور بت تراشی اختیار کی، حسن کا معیار ایسا بدلا کہ جب تک قدیم یونانی مجسموں کے پیچ و خم اور ابھار کو رندے لگا کر بلیرڈ کی میز کی طرح سپاٹ نہ کر دیا جائے وہ آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔ اجنتا کی تصویر اور مائیکل انجلو کے مجسمے بھی اسی سلوک یا بدسلوکی کے سزاوار ہیں کہ ان میں بھی ایک ایسے بھر پور بدن کے خطوط کو ابھارا گیا ہے جو اپنے آپ سے شرمندہ نہیں، لیکن جس کی تاب مضمحل بازو اور تھکے ہوئے اعصاب نہیں لا سکتے۔ اس پر عہد مغلیہ کے مشہور شاعر بہاری کا یہ دوہا صادق آتا ہے:

اپنے انگ کے جان کے ، یوون نرپت پروین
ستن ، من ، نین ، نتمب کو بڑو اجا پھا کین

یعنی اپنے روپ کا انگ جان کر جوانی کے ذہین بادشاہ نے سینہ دل، آنکھوں اور کولھوں میں بڑا اضافہ کیا۔ دیکھا گیا ہے کہ جوانی کا ذہین بادشاہ بسا اوقات ان صنائع بدائع کے استعمال میں فیاضی سے کام لیتا ہے جس کے باعث جمال خودرو کی قطع و برید لازم آتی ہے۔ شکر ہے کہ اب حسن خود کو بڑی حد تک ان حشو و زوائد سے پاک کر چکا ہے۔ اب عورت اقلیدس کے خط مستقیم کی مانند ہے جس میں طول ہے عرض نہیں۔

تاہم بعض رجعت پسندوں کے نزدیک اب بھی مثالی اور متناسب جسم وہ ہے جس میں مندرجہ بالا چار عناصر میں سے پہلے اور چوتھے کا محیط برابر ہو۔ اور کمر کا ناپ ان دونوں سے پندرہ سولہ انچ کم مثلاً ۳۶-۲۱-۳۶ انچ۔ کسی ایکٹرس کے جسم کی اس سے بہتر کوئی تعریف نہیں ہو سکتی کہ اسے انگریزی کے ۸ کے ہندسے سے تشبیہ دی جائے۔ یہ اور بات ہے کہ ۲۴ سال کے سن میں جو خاتون ۸ کا ہندسہ نظر آتی ہیں، وہ ۴۲ سال کی عمر میں دو چشمی ھ بن جائیں!

اگلے وقتوں کے لوگوں کے قویٰ بالعموم ان کے ضمیر سے زیادہ قوی ہوتے تھے۔ اس زمانے میں یہ عقیدہ عام تھا کہ دانا مرد، عورتوں کو "گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے"۔ صنف نازک کے باب میں ان کا نظریہ کم و بیش وہی تھا جو مرزا غالب کا آم کے متعلق ـــــ یعنی یہ کہ بہت ہوں! لیکن اب یہ حال ہے کہ جب تک اچھی طرح ناپ تول نہ کر لی جائے کسی کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آتا۔ بدن کی ناپ تول کا حق پہلے صرف درزی اور گور کن کو حاصل تھا، مگر اب دنیا کی ہر خوب صورت عورت کا جغرافیہ، جس میں وزن اور محرم کا سائز نمایاں ہیں، معلومات عامہ کا جزو بن گیا ہے اور بلاشبہ یہ وہ جزو ہے جو کل پر بھاری ہے۔

وزن حسن کا دشمن ہے۔ (یاد رکھئے رائے کے علاوہ ہر وزنی چیز گھٹیا ہوتی ہے) اسی لیے ہر سمجھ دار عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنی چربی کی دبیز تہوں کے خول کو سانپ کی کینچلی کی طرح اتار کر اپنی عزیز سہیلیوں کو پہنا دے۔ عقد ناگہانی کے بعد کہ جس سے کسی کو مفر نہیں، ہر لڑکی کا بیشتر وقت اپنے وزن اور شوہر سے جنگ کرنے میں گزرتا ہے۔ جہاں تک زن اور وزن کی جنگ کا تعلق ہے، ہم نہیں کہہ سکتے کہ شہید کون ہوتا ہے اور غازی کون لیکن زن اور وزن کی جنگ میں پلہ فریق اول ہی کا بھاری رہتا ہے۔ اس لیے جیت فریق ثانی کی ہوتی ہے۔ مٹاپے میں ایک خرابی یہ ہے کہ تمام عمر گلے کا ہار ہو جاتا ہے۔ اور بعض خواتین گھر کے اندیشوں اور ہمسایوں کی خوش حالی سے بھی دبلی نہیں ہوتیں:

"تن" کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں

دراصل گرہستی زندگی کی آب و ہوا ہی ایسی معتدل ہے کہ مولسری کا پھول دو تین سال میں گوبھی کا پھول بن جائے تو عجب نہیں۔

موٹاپا عام ہو یا نہ ہو مگر دبلے ہونے کی خواہش جتنی عام ہے اتنی شدید بھی۔ آئینے کی جگہ وزن کرنے کی مشین نے لے لی ہے۔ یعنی نئی مشینیں تو ٹکٹ پر وزن کے ساتھ قسمت کا حال بھی بتاتی ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ کچھ عورتوں کی قسمت کے خانے میں صرف ان کا وزن لکھا ہوتا ہے۔ عورتوں کو وزن کم کرنے کی دواؤں سے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی ادھیڑ مردوں کو یونانی دواؤں کے اشتہاروں سے۔ اگر یہ دلچسپی ختم ہو جائے تو دواؤں کے کارخانوں کے ساتھ، بلکہ ان سے کچھ پہلے، وہ اخبارات بھی بند ہو جائیں جن میں یہ اشتہارات نکلتے ہیں۔ اگر آپ کو آسکر وائلڈ کی رائے سے اتفاق ہے کہ آرٹ کا اصل مقصد قدرت کی خام کاریوں کی اصلاح اور فطرت سے فی سبیل اللہ جہاد ہے، تو لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ ہر بدصورت عورت آرٹسٹ ہے۔ اس لیے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد اس کی ساری تگ و دو کا منشا سیاہ کو سفید کر دکھانا، وزن گھٹانا اور ہر سالگرہ پر ایک موم بتی کم کرنا ہے۔ عمر کی تصدیق تو شاید بلدیہ کے "رجسٹر پیدائش و اموات" سے کی جاسکتی ہے۔ لیکن ایک دوسرے کے وزن کے متعلق بھاری سے بھاری بہتان لگایا جاسکتا ہے۔ رائی کا پہاڑ اور گرمی دانے کا مسا بنانا لتری عورتوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ وہ عورت جسے خود اپنی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر نہیں آتے، وہ دوسرے کی جھائیوں پر بے جھجک اپنی بڑھے ہوئے ناخن والی انگلی اٹھاتے وقت یہ بھول جاتی ہے کہ ہر گل کے ساتھ خار اور ہر منہ پر مہاسا ہوتا ہے۔

عورتیں فطرتاً بہت راسخ العقیدہ ہوتی ہیں اور اپنے بنیادی عقائد کی خاطر عمر بھر سب کچھ ہنسی خوشی برداشت کر لیتی ہیں۔ مثلاً سات نمبر پاؤں میں پانچ نمبر کا جوتا۔ وزن کم کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتیں۔۔۔۔ غسل آفتابی، جاپانی مالش، یونانی جلاب، انگریزی کھانا، چہل قدمی، ورزش، فاقہ۔۔۔۔ پہلے چہل قدمی کو لیجئے کہ امرت دھارا کی طرح یہ ہر مرض کی دوا ہے۔ سوکھے ساکھے مرد اپنا وزن بڑھانے اور عورتیں اپنا وزن گھٹانے کے لیے ٹہلتی ہیں۔ جس طرح چائے گرمی میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے اور سردی میں حدت، اسی طرح چہل قدمی دبلے کو موٹا اور موٹے کو دبلا کرتی ہے۔ اگر ہماری طرح آپ کو بھی الفنسٹن اسٹریٹ پر ٹہلنے کا شوق ہے تو آپ نے بعض میاں بیوی کو ان مختلف بلکہ متضاد عزائم کے ساتھ پابندی سے "ہوا خوری" کرتے دیکھا ہوگا۔ عورتوں کا انجام ہمیں معلوم نہیں، لیکن یہ ضرور دیکھا ہے کہ بہت سے "ہوا خور" رفتہ رفتہ "حوا خور" ہو جاتے ہیں۔

جو عورتیں دواؤں سے پرہیز کرتی ہیں، وہ صرف ورزش سے خود کو "سلم" رکھ سکتی ہیں۔ "سلمنگ" کے موضوع پر عورتوں کی رہبری کے لیے بے شمار باتصویر کتابیں ملتی ہیں، جن کے مضامین عورتیں پڑھتی ہیں اور تصویروں سے مرد جی بہلاتے ہیں۔ ان میں

بتایا جاتا ہے کہ مرد کاٹھ کے پتلے کی مانند ہے ۔لیکن عورت موم کی طرح نرم ہے ۔ چنانچہ مرد کو ہر سانچے میں ڈھال سکتی ہے ۔ پھر اس کے اپنے گوشت پوست میں قدرت نے وہ لوچ رکھا ہے کہ

سمٹے تو دل عاشق ، پھیلے تو زمانہ ہے

چنانچہ ہر عضو بدن کے لیے ایک علیحدہ ورزش ہوتی ہے ۔ مثلاً دوہری ٹھوڑی کو اکہری کرنے کی ورزش ۔ ۱۵ انچ کو ۱۵ انچ بنانے کی کسرت ۔ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر غذا ہضم کرنے کی ترکیب ۔ شرعی عیوب کا ہپناٹزم سے علاج وغیرہ ۔ توند کے لیے ماہرین کا خیال ہے کہ سیاست داں کے ضمیر کی مانند ہے ۔ اس کی لچک کو ذہن نشین کرانے کی غرض سے وہ اکثر اسے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کے " وقت " سے تشبیہ دیتے ہیں جس کے متعلق وہ کہہ گئے ہیں کہ

وقت میں تنگی فراخی دونوں ہیں جیسے ربڑ
کھینچے سے کھنچتی ہے ، چھوڑے سے جاتی ہے سکڑ

حق تو یہ ہے کہ جدید سائنس نے اس قدر ترقی کرلی ہے کہ دماغ کے علاوہ جسم کا ہر حصہ حسب منشا گھٹایا بڑھایا جاسکتا ہے ۔

یہی حال عورتوں کے رسالوں کا ہے ۔ ان کے (رسالوں) کے تین ٹکڑے کیے جاسکتے ہیں ۔ اول ، آزادئ اطفال اور شوہر کی تربیت و نگہداشت ۔ دوم ، کھانا پکانے کی ترکیبیں ۔ سوم ، کھانا نہ کھانے کی ترکیبیں ۔ ان مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ تشخیص سب کی ایک ہی ہے ۔ بس نسخے مختلف ہیں ۔ پرہیز بہر صورت یکساں ! (اس امر پر سب متفق ہیں کہ افزائش حسن کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ایسی غذا کھائی جائے جس سے خون صالح پیدا نہ ہو اور جو جزو بدن نہ ہو سکے ۔ ہماری رائے میں کسی پڑھی لکھی عورت کے لیے اس سے سخت اور کون سی سزا ہو سکتی ہے کہ اسے چالیس دن تک اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھلایا جائے ۔ دبلے ہونے کا اس سے بہتر اور زود اثر طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا ۔

رسالوں کے اس حصے میں تاریخی ناولوں کا چٹخارہ اور یونانی طب کی چاشنی ہوتی ہے ۔ اس لیے نہایت شوق سے پڑھا جاتا ہے ۔ چند عنوانات اور ٹوٹکے بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں :

زلیخا حضرت یوسف کے پیچھے دوڑنے کی وجہ سے دوبارہ جوان ہوئی ۔ قلوپطرہ کے نازک اندام ہونے کا راز یہ ہے کہ وہ نہار منہ مصری تربوز کا پانی اور رعیت کا خون پیتی تھی ۔ ملکہ الزبتھ اس لیے دبلی تھی کہ میری آف اسکاٹ نے اس کا موم کا پتلا بنا رکھا تھا ، جس میں وہ چاندنی رات میں سوئیاں چبھویا کرتی تھی ۔ ۔ کیتھرین ، ملکہ روس کے " سلم " ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ بیگن کے سر پر بھی تاج ہوتا ہے ، بلکہ اس میں کوئی پروٹین نہیں ہوتی ۔ ملکہ ممتاز محل اور تاج محل کی خوبصورتی کا راز ایک ہی ہے ـــ سفید رنگ ! ایکٹرس آڈرے ہیپ برن اس لیے موٹی نہیں ہوتی کہ وہ ناشتے میں نشاستے سے پرہیز کرتی ہے اور پھیکی چائے پیتی ہے جس سے چربی پگھلتی ہے ۔

چائے کی پتی سے گھٹ سکتا ہے عورت کا شکم

دبلے آدمی کینہ پرور ، سازشی اور دغاباز ہوتے ہیں ۔ یہ ہماری نہیں بلکہ جولیس سیزر کی رائے ہے ، جس نے ایک مریل سے درباری کے ہاتھوں قتل ہو کر اپنے قول کو سچا کر دکھایا ۔ گو کہ ہمارے موزے کا سائز صرف گیارہ اور بنیان کا چونتیس ہے ۔ لیکن ہمیں بھی اس نظریہ سے اتفاق ہے ۔ کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ موٹی عورتیں فطرتاً ملنسار ، ہنس مکھ اور صلح پسند ہوتی ہیں ۔ وہ نہ خود لڑتی ہیں اور نہ مرد ان کے نام پر تلوار اٹھاتے ہیں ممکن ہے کوئی صاحب اس کا یہ جواز پیش کریں کہ چونکہ ایسی گج گامنی کی حس و حرکت بغیر جر ثقیل کے ممکن نہیں ، لہٰذا وہ نہ ڈٹ کر لڑ سکتی ہے ، اور نہ میدان چھوڑ کر بھاگ سکتی ہے ۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ آج تک کسی موٹی عورت

کی وجہ سے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔

خدا نخواستہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم حسن میں بارس پاور کے متلاشی ہیں اور اکھاڑے کی رونق کو چھپر کھٹ کی زینت بنانے کی سفارش کر رہے ہیں۔ ہمارے ذہن میں حسن بے پروا کا یہ سراپا نہیں کہ ہر خط بدن ایک دائرہ بنا رہا ہے۔ پیٹ پر ٹائر بندھا ہوا ہے۔ چہرے سے لگتا ہے کہ ابھی ابھی بھڑوں نے کاٹا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ اس بچاری کا سینہ ارمانوں کا مدفن ہے تو یہ صاف ظاہر ہے کہ مرحومین کی تعداد کچھ زیادہ ہی تھی۔ کھلے ہوئے گلے کے بلاؤز کا یہ عالم کہ کوئی شیر خوار بچہ دیکھ پائے تو بلبلا اٹھے۔ تنگ پوشی کا حال کہ کوزے میں دریا بلکہ پہاڑ بند۔ ٹانگیں جیسے بوڑھے ہاتھی کی سونڈ جن پر غرارہ بھی چوڑا پاجامہ معلوم ہوتا ہے۔

ایسی ہی چوڑی چکلی خاتون کا لطیفہ ہے کہ انھوں نے بس ڈرائیور سے بڑی لجاجت سے کہا "بھیا! ذرا مجھے بس سے اتروا دے۔" ڈرائیور نے مڑکر دیکھا تو اس کا چہرہ فرشتوں کی طرح تمتما اٹھا۔۔۔ ان فرشتوں کی طرح جنھوں نے بار خلافت اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر خود ہی بولیں "میری عادت ہے کہ دروازے سے الٹی اترتی ہوں مگر تمہاری الٹی کھوپڑی کا کنڈکٹر سمجھتا ہے کہ چڑھ رہی ہوں اور ہر دفعہ زبردستی اندر دھکیل دیتا ہے تین اسٹاپ نکل گئے۔"

ہم یہاں یہ پرچار نہیں کر رہے کہ حسن اور وزن میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لیے کہ اب خود اس مثالی رشتے کے بند ٹوٹ چکے ہیں۔ ہم تو صرف قارئین کرام کو اطمینان دلانا چاہتے ہیں کہ تندرستی کوئی علاج نسوانی مرض نہیں ہے۔ ہمیں کمزوری میں، جب تک وہ اخلاقی نہ ہو، بظاہر کوئی دل کشی نظر نہیں آتی۔ اسی طرح فاقہ کشی صرف دو صورتوں میں جائز ہے ۔۔۔ کسی شرعی ضرورت سے یا بطور ستیہ گرہ۔ مگر وزن گھٹانے کی غرض سے جو فاقہ کشی کی جاتی ہے اس کی محرک کوئی روحانی حاجت یا سیاسی مصلحت نہیں بلکہ خدائے مجازی کی پسند ہے۔ اس پیکر تصویر کے خطوط کی بے کیف سادگی اور پھیکا پن مرد کے عجز تصور کے فریادی ہیں۔ یہ کہنا تو زیادتی ہوگی کہ حسن بیمار کے پیچھے ایک چھکے چھکائے تھکے ہوئے حسن پرست کی جنسی اکتاہٹ کارفرما ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مرد کی پسند وہ پل صراط ہے جس پر کوئی موٹی عورت نہیں چل سکتی۔۔ ☆

(چراغ تلے سے)

مشتاق احمد یوسفی

خاکم بدہن کا مقدمہ

دست زلیخا

بابائے انگریزی ڈاکٹر سموئیل جانسن کا یہ قول دل کی سیاہی سے لکھنے کے لائق ہے کہ جو شخص روپے کے لالچ کے علاوہ کسی اور جذبے کے تحت کتاب لکھتا ہے، اس سے بڑا احمق روئے زمین پر کوئی نہیں۔ ہمیں بھی اس کلیے سے حرف بہ حرف اتفاق ہے، بشرطیکہ کتاب سے مراد وہی ہے جو ہم سمجھے ہیں، یعنی چیک بک یا روکڑ بہی۔ دیباچے میں یہ وضاحت ازبس ضروری ہے کہ یہ کتاب کس مالی یا الہامی دباؤ سے نڈھال ہو کر لکھی گئی۔ چنانچہ جو اہل قلم ذہین ہیں، وہ مشک کی طرح خود بولتے ہیں۔ جو ذرا زیادہ ذہین ہیں، وہ اپنے کندھے پر دوسروں سے بندوق چلواتے ہیں۔ خود دیباچہ لکھنے میں وہی سہولت اور فائدے مضمر ہیں، جو خودکشی میں ہوتے ہیں۔ یعنی تاریخ وفات، آلۂ قتل اور موقع واردات کا انتخاب صاحب معاملہ خود کرتا ہے۔ اور تعزیرات پاکستان میں یہ واحد جرم ہے، جس کی سزا صرف اس صورت میں ملتی ہے کہ ملزم ارتکاب جرم میں کامیاب نہ ہو۔ ۱۹۶۱ میں پہلی ناکام کوشش کے بعد بحمداللہ ہمیں ایک بار پھر یہ سعادت بقلم خود نصیب ہو رہی ہے۔ تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد۔

یہ کتاب "چراغ تلے" کے پورے آٹھ سال بعد شائع ہو رہی ہے۔ جن قدردانوں کو ہماری پہلی کتاب میں تازگی، زندہ دلی اور جواں سالی کا عکس نظر آیا، ممکن ہے، ان کو دوسری میں کہولت کے آثار دکھلائی دیں۔ اس کی وجہ ہمیں تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی عمر میں آٹھ سال کا اضافہ ہو چکا ہے۔

انسان کو حیوان ظریف کہا گیا ہے۔ لیکن یہ حیوانوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ اس لیے کہ دیکھا جائے تو انسان واحد حیوان ہے جو مصیبت پڑنے سے پہلے مایوس ہو جاتا ہے۔ انسان واحد جاندار ہے، جسے خلاق عالم نے اپنے حال پر رونے کے لیے غدود گریہ بخشے ہیں۔ کثرت استعمال سے یہ بڑھ جائیں تو حساس طنز نگار دنیا سے یوں خفا ہو جاتے ہیں جیسے اگلے وقتوں میں آقا نمک حرام لونڈیوں سے روٹھ جایا کرتے تھے۔ لغزش غیر پر انھیں ہنسی کے بجائے طیش آجاتا ہے۔ ذہین لوگوں کی ایک قسم وہ بھی ہے جو احمقوں کا وجود سرے سے برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ لیکن، جیسا کہ مارکوئس دی سید نے کہا تھا، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سبھی انسان احمق ہوتے ہیں۔ موصوف نے تو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ اگر تم واقعی کسی احمق کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے تو خود کو اپنے کمرے میں مقفل کر لو اور آئینہ توڑ کر پھینک دو۔

لیکن مزاح نگار کے لیے نصیحت، فضیحت اور فہمائش حرام ہیں۔ وہ اپنے اور تلخ حقائق کے درمیان ایک قد آدم دیوار قہقہہ کھڑی کر لیتا ہے۔ وہ اپنا روئے خنداں، سورج مکھی پھول کی مانند، ہمیشہ سرچشمۂ نور کی جانب رکھتا ہے اور جب اس کا سورج ڈوب جاتا ہے تو اپنا رخ اس سمت کر لیتا ہے جدھر سے وہ پھر طلوع ہوگا:

ہمہ آفتاب بینم ، ہمہ آفتاب گویم
نہ شبم، نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

حس مزاح ہی دراصل انسان کی چھٹی حس ہے۔ یہ ہو تو انسان ہر مقام سے آسان گزر جاتا ہے۔

بے نشہ کس کو طاقت آشوب آگہی

یوں تو مزاح، مذہب اور الکحل ہر چیز میں بآسانی حل ہوجاتے ہیں، بالخصوص اردو ادب میں۔ لیکن مزاح کے اپنے تقاضے، اپنے ادب آداب ہیں۔ شرط اول یہ کہ برہمی، بیزاری اور کدورت دل میں راہ نہ پائے۔ ورنہ یہ بومرنگ پلٹ کر خودشکاری کا کام تمام کردیتا ہے۔ مزا تو جب ہے کہ آگ بھی لگے اور کوئی انگلی نہ اٹھاسکے کہ "یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے؟" مزاح نگار اس وقت تک تبسم زیر لب کا سزاوار نہیں، جب تک اس نے دنیا اور اہل دنیا سے رج کے (رج کے (پنجابی): جی بھر کے) پیار نہ کیا ہو۔ ان سے، ان کی بے مہری و کم نگاہی سے۔ ان کی سرخوشی و ہشیاری سے۔ ان کی تردامانی اور تقدس سے۔ ایک پیمبر کے دامن پر پڑنے والا ہاتھ گستاخ ضرور ہے، مگر مشتاق و آرزومند بھی ہے۔ یہ زلیخا کا ہاتھ ہے۔ خواب کو چھو کر دیکھنے والا ہاتھ۔

صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی

ایک صاحب طرز ادیب نے، جو سخن فہم ہونے کے علاوہ ہمارے طرفدار بھی ہیں (تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ سود خوار ہوتا ـــــ کی حد تک) رسالے میں دبی زبان سے یہ شکوہ کیا کہ ہماری شوخی تحریر مسائل حاضرہ کے عکس اور سیاسی سوز و گداز سے عاری ہے۔ اپنی صفائی میں ہم مختصراً اتنا ہی عرض کریں گے کہ طعن و تشنیع سے اگر دوسروں کی اصلاح ہو جاتی تو بارود ایجاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کہ رمز و کنایہ میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں، ایک اندھیری رات کی بات سناتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جنگل بیابان میں ایک بچہ اپنی ماں سے چمٹ کر کہنے لگا کہ امی! اندھیرے میں مجھے ایک کالا دیو نظر آتا ہے اور مارے ڈر کے میری تو گھگی بندھ جاتی ہے۔ ماں نے جواب دیا، بیٹا! تو مرد بچہ ہے۔ خوف کو دل سے نکال دے۔ اب کی دفعہ جیسے ہی وہ دکھائی دے، آگے بڑھ کے حملہ کر دینا۔ وہیں پتا چل جائے گا کہ حقیقت ہے یا محض تیرا فہم۔ بچے نے پوچھا، امی! اگر اس کالے دیو کی امی نے بھی اسے یہی نصیحت کر رکھی ہو تو۔۔۔؟

کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں؟

کچھ دن بعد وہ رسالہ کہ سرخیل دانشوراں تھا اور جس میں راقم الحروف کی سیاسی بے حسی و بے رغبتی کی تشخیص کی گئی تھی، نواب کالا باغ کے حکم سے بند کر دیا گیا۔ ہمارے قدردان نے ایک پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے ٹھیکیدار کے ہاں بحیثیت پبلسٹی منیجر ملازمت کر لی۔ فقیر نے بھی یاران نامہرباں اور شہر بے اماں سے رخصت چاہی اور بوریا بدھنا سنبھال، داتا کی نگری کی راہ لی: او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

"پروفیسر"، "بارے آلو کا کچھ بیاں ہو جائے" اور بائی فوکل کلب، اسی سفر شوق کی یادگار ہیں۔ پڑھنے والوں کو ان کا رنگ مختلف نظر آئے تو یہ زندہ دلان لاہور کا فیضان صحبت ہے۔

لوگ کیوں، کب اور کیسے ہنستے ہیں؟ جس دن ان سوالوں کا صحیح صحیح جواب معلوم ہو جائے گا، انسان ہنسنا چھوڑ دے گا۔ رہا یہ سوال کہ کس پر ہنستے ہیں؟ تو اس کا انحصار حکومت کی تاب و رواداری پر ہے۔ انگریز صرف ان چیزوں پر ہنستے ہیں، جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔۔۔ پنچ کے لطیفے، موسم، عورت، تجریدی آرٹ۔ اس کے برعکس، ہم لوگ ان چیزوں پر ہنستے ہیں، جو اب ہماری سمجھ میں آگئی ہیں۔ مثلاً انگریز، عشقیہ شاعری، روپیہ کمانے کی ترکیبیں، بنیادی جمہوریت۔

فقیر کی گالی، عورت کے تھپڑ اور مسخرے کی بات سے آزردہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ قول فیصل ہمارا نہیں، مولانا عبید زاکانی کا ہے (از دشنام گدایاں و سیلیٔ زناں و زبان شاعراں و مسخرگاں مرنجید)۔ مزاح نگار اس لحاظ سے بھی فائدے میں رہتا ہے کہ اس کی فاش سے فاش غلطی کے بارے میں بھی پڑھنے والے کو یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ ممکن ہے، اس میں بھی تفنن کا کوئی لطیف پہلو پوشیدہ ہو، جو غالباً موسم کی خرابی کے سبب اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس بنیادی حق سے دستبردار ہوئے بغیر یہ تسلیم کر لینے میں چنداں مضائقہ نہیں

کہ ہم، زبان اور قواعد کی پابندی کو تکلف زائد تصور نہیں کرتے۔ یہ اعتراف عجز اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ آج کل بعض اہل قلم بڑی کوشش اور کاوش سے غلط زبان لکھ رہے ہیں۔ ہاں کبھی کبھار بے دھیانی یا محض آلکس میں صحیح زبان لکھ جائیں تو اور بات ہے۔ بھول چوک کس سے نہیں ہوتی؟

محترم و مکرم جناب شان الحق صاحب حقی نے جس توجہ اور محبت سے اس مجموعے کے پانچ مضامین کا مطالعہ فرمایا، اس کے لیے راقم الحروف ہمہ تن سپاس ہے۔ انھوں نے نہ صرف مفید مشوروں سے سرفراز فرمایا، بلکہ یہ کہہ کر مصنف کا دل بڑھایا کہ آپ کہیں کہیں گھسے پٹے محاورے استعمال کر جاتے ہیں، مگر آپ کا املا بے حد "اوریجنل" ہے۔ چنانچہ مبدء کو مبدر، پرواہ کو پروا، اور وطیرہ کو وتیرہ، لکھنا ہم نے انھیں سے سیکھا۔ اور یہ بھی انھیں سے معلوم ہوا کہ عطائی، اور طوطا، کا صحیح املا اتائی اور توتا ہے! جوش اصلاح میں ہم تو طوائف کو بھی "ت" سے لکھنے پر طیار تھے، مگر طوطے والی بات دل کو نہیں لگی۔ اس لیے کہ توتے کو اگر ط سے لکھا جائے تو نہ صرف یہ کہ زیادہ ہرا معلوم ہوتا ہے، بلکہ ط کا دائرہ ذرا ڈھنگ سے بنائیں تو چونچ بھی نظر آنے لگتی ہے۔

اور جھوٹ کیوں بولیں، طوائف الملوکی، کا صحیح مفہوم بھی حقی صاحب ہی نے بتایا، ورنہ ہم تو کچھ اور سمجھے بیٹھے تھے۔ عربی و فارسی میں بس اتنی شد بد ہے کہ میٹرک تک ہم ایضاً کو کسی بسیار گو شاعر کا تخلص سمجھ کر ہر غزل ایضاً، پر اپنا خون کھولاتے رہے۔ یادش بخیر! راہ زن کے لغوی معنی مرزا نے اسی زمانے میں زن بازاری بتائے تھے! اور سچ تو یہ ہے کہ جب سے اس کے صحیح معنی معلوم ہوئے ہیں غالب اور آتش کے مصرعوں، ہو کر اسیر دابتے ہیں راہ زن کے پانوں، اور ہزار رہ زن امیدوار راہ میں ہے، کا سارا لطف ہی جاتا رہا۔ اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے؟

ازبسکہ حقی صاحب تحقیق کے مرد میداں ہیں، انھیں قدیم الفاظ و واقعات کے علاوہ کوئی اور بات مشکل سے یاد رہتی ہے۔ مثلاً وہ یہ فوراً بتا دیں گے "تیں، کب متروک ہوا۔ استاد، (غالب) کے کلام میں "آئنہ، کتنی مرتبہ آیا ہے، "ستم پیشہ ڈومنی، نے مغل بچہ کو کس سنہ میں داغ مفارقت دیا "استاد، کے مکان کا پتا اور بقایا کرایہ کیا تھا۔ لیکن اپنے مکان کا نمبر بتانے کے لیے انھیں بیگم سے تبادلہ شکوک کرنا پڑتا ہے۔ وہ خود بھی اپنی غیر حاضر دماغی کے لطیفوں کو، سکھوں کے سمجھ کر، خوب محظوظ ہوتے ہیں۔ ایک دن The Absent-Minded Professor فلم کی پیشگی بکنگ کے "کیو میں ملاقات ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں کیو سے اس پر بحث کرتے ہوئے گتھم گتھا نکلے، بلکہ نکالے گئے، کہ صحیح لفظ قمیض، ہے یا قمیص۔ مرزا سے رجوع کیا تو فرمایا، صحیح پہناوا بشرٹ ہے! باہر نکلے تو ہم نے اپنی کار کا دروازہ کھولا اور حقی صاحب شکریہ ادا کرتے ہوئے داخل ہی نہیں ہوئے بلکہ اسٹیرنگ وہیل سنبھال لیا۔ اپنے کوٹ کی اندرونی و بیرونی جیبوں کو کھنگالنے کے بعد ہاتھ کی اتفاقی رگڑ سے ہماری پتلون کی جیب کو بھی ٹٹول لیا۔ بالآخر اپنے قمیض یا اپنی قمیص کی جیب سے ایک چابی برآمد کی۔ پورا زور لگانے کے باوجود یہ چابی نہ لگی تو فرمایا کہ اس ناہنجار ڈرائیور کو ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ کسی اور ورکشاپ میں سروس کرائے۔ جب بھی سروس ہوتی ہے، ایک نئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم نے ہمت کر کے عرض کیا۔ قصور دراصل ہماری کار کے سوراخ کا ہے، جو آپ کی چابی میں فٹ نہیں ہو رہا۔ چمک کر بولے۔ قصور پر خوب یاد آیا آپ نے ایک جگہ فوتیدگی لکھا ہے۔ یہ مارواڑیوں کی سی اردو آپ نے کہاں سے سیکھی؟ عرض کیا، مارواڑ میں، جہاں ہم پیدا ہوئے۔ ہمیں کار سے اتار کر فٹ پاتھ پر گلے لگاتے ہوئے بولے، تو گویا اردو آپ کی مادری زبان نہیں ہے! حالانکہ آپ کی اہلیہ تو اہل زبان ہیں!

خدا انھیں خوش رکھے کہ انھوں نے ہماری اردو کی نوک پلک سنوارنے میں ہماری بیگم کا ہاتھ بٹایا ہے۔

لاہور
۲۳ اکتوبر ۱۹۶۹

مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی

ہوئے مر کے ہم جو رسوا

اب تو معمول سا بن گیا ہے کہ کہیں تعزیت یا تجہیز و تکفین میں شریک ہونا پڑے تو مرزا کو ضرور ساتھ لے لیتا ہوں۔ ایسے موقعوں پر ہر شخص اظہار ہمدردی کے طور پر کچھ نہ کچھ ضرور کہتا ہے۔ قطعہ تاریخ وفات ہی سہی۔ مگر مجھے نہ جانے کیوں چپ لگ جاتی ہے، جس سے بعض اوقات نہ صرف پس ماندگان کو بلکہ خود مجھے بھی بڑا دکھ ہوتا ہے۔ لیکن مرزا نے چپ ہونا سیکھا ہی نہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ صحیح بات کو غلط موقع پر بے دغدغہ کہنے کی جو خداداد صلاحیت انہیں ودیعت ہوئی ہے وہ کچھ ایسی ہی تقریبوں میں گل کھلاتی ہے۔ وہ گھپ اندھیرے میں سرِ رہگزر چراغ نہیں جلاتے، پھلجھڑی چھوڑتے ہیں، جس سے بس ان کا اپنا چہرہ رات کے سیاہ فریم میں جگ مگ جگ مگ کرنے لگتا ہے اور پھلجھڑی کا لفظ تو یونہی مروت میں قلم سے نکل گیا، ورنہ ہوتا یہ ہے کہ:

جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کر اٹھے

اس کے باوصف، وہ خدا کے ان حاضر و ناظر بندوں میں سے ہیں جو محلے کی ہر چھوٹی بڑی تقریب میں شادی ہو یا غمی، موجود ہوتے ہیں۔ بالخصوص دعوتوں میں سب سے پہلے پہنچتے اور سب کے بعد اٹھتے ہیں۔ اس انداز نشست و برخاست میں ایک کھلا فائدہ یہ دیکھا کہ وہ باری باری سب کی غیبت کر ڈالتے ہیں ان کی کوئی نہیں کر پاتا۔

چنانچہ اس سنیچر کی شام کو بھی میوہ شاہ قبرستان میں وہ میرے ساتھ تھے۔ سورج اس شہر خموشاں کو جسے ہزاروں بندگان خدا نے مر کے بسایا تھا، لال انگارہ سی آنکھ سے دیکھتا دیکھتا انگریزوں کے اقبال کی طرح غروب ہو رہا تھا۔ سامنے بیری کے درخت کے نیچے ایک ڈھانچہ قبر بدر پڑا تھا۔ چاروں طرف موت کی عمل داری تھی اور سارا قبرستان ایسا اداس اور اجاڑ تھا جیسے کسی بڑے شہر کا بازار اتوار کو۔ سبھی رنجیدہ تھے۔ (بقول مرزا، دفن کے وقت میت کے علاوہ سب رنجیدہ ہوتے ہیں۔) مگر مرزا سب سے الگ تھلگ ایک پرانے کتبے پر نظریں گاڑے مسکرا رہے تھے۔ چند لمحوں بعد میرے پاس آئے اور میری پسلیوں میں اپنی کہنی سے آنکس لگاتے ہوئے اس کتبے تک لے گئے جس پر منجملہ تاریخ پیدائش و پنشن، مولد و مسکن، ولدیت و عہدہ (اعزازی مجسٹریٹ درجہ سوم) آسودہ لحد کی تمام ڈگریاں مع ڈویژن اور یونیورسٹی کے نام کے کندہ تھیں اور آخر میں، نہایت جلی حروف میں، منہ پھیر کر جانے والے کو بذریعہ قطعہ بشارت دی گئی تھی کہ اللہ نے چاہا تو بہت جلد اس کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے۔

میں نے مرزا سے کہا "یہ لوح مزار ہے یا ملازمت کی درخواست؟ بھلا ڈگریاں، عہدہ اور ولدیت وغیرہ لکھنے کا کیا تک تھا؟"

انہوں نے حسب عادت بس ایک لفظ پکڑ لیا۔ کہنے لگے "ٹھیک کہتے ہو جس طرح آج کل کسی کی عمر یا تنخواہ دریافت کرنا بری بات سمجھی جاتی ہے، اسی طرح، بالکل اسی طرح بیس سال بعد کسی کی ولدیت پوچھنا بد اخلاقی سمجھی جائے گی"؟

اب مجھے مرزا کی چونچال طبیعت سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ لہٰذا انہیں ولدیت کے مستقبل پر مسکراتا چھوڑ کر میں آٹھ دس قبر دور ایک ٹکڑی میں شامل ہو گیا، جہاں ایک صاحب جنت مکانی کے حالات زندگی مزے لے لے کر بیان کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے

کہ خدا غریق رحمت کرے ، مرحوم نے اتنی لمبی عمر پائی کہ ان کے قریبی اعزہ دس پندرہ سال سے ان کی انشورنس پالیسی کی امید میں جی رہے تھے ۔ ان امیدواروں میں سے بیشتر کو مرحوم خود اپنے ہاتھ سے مٹی دے چکے تھے ۔ بقیہ کو یقین ہوگیا تھا کہ مرحوم نے آب حیات نہ صرف چکھا ہے بلکہ ڈگڈگا کے پی چکے ہیں ۔ راوی نے تو یہاں تک بیان کیا کہ ازبسکہ مرحوم شروع سے رکھ رکھاؤ کے حد درجہ قائل تھے ۔ لہٰذا آخر تک اس صحت بخش عقیدے پر قائم رہے کہ چھوٹوں کو تعظیماً پہلے مرنا چاہیئے ۔ البتہ ادھر چند برسوں سے ان کو فلک کج رفتار سے یہ شکایت ہو چلی تھی کہ افسوس اب کوئی دشمن ایسا باقی نہیں رہا جسے وہ مرنے کی بددعا دے سکیں ۔

ان سے کٹ کر میں ایک دوسری ٹولی میں جا ملا ۔ یہاں مرحوم کے ایک شناسا اور میرے پڑوسی ان کے گیلنٹر لڑکے کو صبر جمیل کی تلقین اور گول مول الفاظ میں نعم البدل کی دعا دیتے ہوئے فرما رہے تھے کہ برخوردار! یہ مرحوم کے مرنے کے دن نہیں تھے ۔ حالانکہ پانچ منٹ پہلے یہی صاحب ، جی ہاں ، یہی صاحب مجھ سے کہہ رہے تھے کہ مرحوم نے پانچ سال قبل دونوں بیویوں کو اپنے تیسرے سہرے کی بہاریں دکھائی تھیں اور یہ ان کے مرنے کے نہیں ، ڈوب مرنے کے دن تھے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے انگلیوں پر حساب لگا کر کانا پھوسی کے انداز میں یہ تک بتایا کہ تیسری بیوی کی عمر مرحوم کی پنشن کے برابر ہے ۔ مگر ہے بالکل سیدھی اور بے زبان۔ اس اللہ کی بندی نے کبھی پلٹ کر نہیں پوچھا کہ تمہارے منہ میں کے دانت نہیں ہیں ۔ مگر مرحوم اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ انہوں نے محض اپنی دعاؤں کے زور سے موصوفہ کا چال چلن قابو میں کر رکھا ہے ۔ البتہ بیاہتا بیوی سے ان کی کبھی نہیں بنی ۔ بھری جوانی میں بھی میاں بیوی ۶۳ کے ہندسے کی طرح ایک دوسرے سے منہ پھیرے رہے اور جب تک جیے ، ایک دوسرے کے اعصاب پر سوار رہے ۔ ممدوحہ نے مشہور کر رکھا تھا کہ (خدا ان کی روح کو نہ شرمائے) مرحوم شروع سے ہی ایسے ظالم تھے کہ ولیمے کا کھانا بھی مجھ نئی نویلی دلہن سے پکوایا ۔

میں نے گفتگو کا رخ موڑنے کی خاطر گنجان قبرستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ دیکھتے ہی دیکھتے چپہ چپہ آباد ہوگیا ۔ مرزا حسب معمول پھر بیچ میں کود پڑے ۔ کہنے لگے ، دیکھ لینا ، وہ دن زیادہ دور نہیں جب کراچی میں مردے کو کھڑا گاڑنا پڑے گا اور نائیلون کے ریڈی میڈ کفن میں اوپر زپ (ZIP) لگے گی تاکہ منہ دیکھنے دکھانے میں آسانی رہے ۔

میری طبیعت ان باتوں سے اوبنے لگی تو ایک دوسرے غول میں چلا گیا ، جہاں دو نوجوان ستار کے غلاف جیسی پتلونیں چڑھائے چہک رہے تھے ۔ پہلے " ٹیڈی بوائے " کی پیلی قمیص پر لڑکیوں کی ایسی واہیات تصویریں بنی ہوئی تھیں کہ نظر پڑتے ہی ثقہ آدمی لاحول پڑھنے لگتے تھے اور ہم نے دیکھا کہ ہر ثقہ آدمی بار بار لاحول پڑھ رہا ہے ۔ دوسرے نوجوان کو مرحوم کی بے وقت موت سے واقعی دلی صدمہ پہنچا تھا ، کیوں کہ اس کا سارا " ویک اینڈ " چوپٹ ہوگیا تھا ۔

چونچوں اور چہلوں کا یہ سلسلہ شاید کچھ دیر اور جاری رہتا کہ اتنے میں ایک صاحب نے ہمت کرکے مرحوم کے حق میں پہلا کلمہ خیر کہا اور میری جان میں جان آئی ۔ انہوں نے صحیح فرمایا " یوں آنکھ بند ہونے کے بعد لوگ کیڑے نکالنے لگیں ، یہ اور بات ہے ، مگر خدا ان کی قبر کو عنبریں کرے ، مرحوم بلاشبہ صاف دل ، نیک نیت انسان تھے اور نیک نام بھی ۔ یہ بڑی بات ہے " ۔

" نیک نامی میں کیا کلام ہے ۔ مرحوم اگر یونہی منہ ہاتھ دھونے بیٹھ جاتے تو سب یہی سمجھتے کہ وضو کر رہے ہیں .... " جملہ ختم ہونے سے پہلے مداح کی چمکتی چندیا یکایک ایک دھنسی ہوئی قبر میں غروب ہوگئی ۔

اس مقام پر ایک تیسرے صاحب نے (جن سے میں واقف نہیں) " روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ " والے لہجے میں نیک نیتی اور صاف دلی کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ اپنی پیدائشی بزدلی کے سبب تمام عمر گناہوں سے بچے رہتے ہیں ۔ ان کے

برعکس بعضوں کے دل و دماغ واقعی آئینے کی طرح صاف ہوتے ہیں یعنی نیک خیال آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔
شامت اعمال کہ میرے منہ سے نکل گیا۔ "نیت کا حال صرف خدا پر روشن ہے مگر اپنی جگہ یہی کیا کم ہے کہ مرحوم سب کے دکھ سکھ میں شریک اور ادنیٰ سے ادنیٰ پڑوسی سے بھی جھک کر ملتے تھے"۔
ارے صاحب! یہ سنتے ہی وہ صاحب تو لال بھبوکا ہو گئے۔ بولے "حضرت! مجھے خدائی کا دعویٰ تو نہیں۔ تاہم اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اکثر بوڑھے خرانٹ اپنے پڑوسیوں سے محض اس خیال سے جھک کر ملتے ہیں کہ اگر وہ خفا ہو گئے تو کندھا کون دے گا"۔
خوش قسمتی سے ایک خدا ترس نے میری حمایت کی۔ میرا مطلب ہے مرحوم کی حمایت کی۔ انہوں نے کہا کہ مرحوم نے ماشاء اللہ اتنی لمبی عمر پائی۔ مگر صورت پر ذرا نہیں برستی تھی۔ چنانچہ سوائے کنپٹیوں کے اور بال سفید نہیں ہوئے۔ چاہتے تو خضاب لگا کے خوردوں میں شامل ہو سکتے تھے۔ مگر طبیعت ایسی قلندرانہ پائی تھی کہ خضاب کا کبھی جھوٹوں بھی خیال نہیں آیا۔
وہ صاحب بیچ بیچ پھٹ پڑے "آپ کو خبر بھی ہے؟ مرحوم کا سارا سر پہلے نکاح کے بعد ہی سفید گالا ہو گیا تھا۔ مگر کنپٹیوں کو وہ قصداً سفید رہنے دیتے تھے تا کہ کسی کو شبہ نہ گزرے کہ خضاب لگاتے ہیں۔ سلور گرے قلمیں! یہ تو ان کے میک اپ میں ایک نیچرل ٹچ تھا!"۔
"ارے صاحب! اسی مصلحت سے انہوں نے اپنا ایک مصنوعی دانت بھی توڑ رکھا تھا" ایک دوسرے بدگو نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی۔
"کچھ بھی سہی وہ ان کھوسٹوں سے ہزار درجے بہتر تھے جو اپنے پوپلے منہ اور سفید بالوں کی داد چھوٹوں سے یوں طلب کرتے ہیں گویا یہ ان کی ذاتی جدوجہد کا ثمرہ ہے۔" مرزا نے بگڑی بات بنائی۔
ان سے پیچھا چھڑا کر کچی پکی قبریں پھاندتا میں منشی ثناء اللہ کے پاس جا پہنچا جو ایک کتبے سے ٹیک لگائے بیری کے ہرے ہرے پتے کچر کچر چبا رہے تھے اور اس امر پر بار بار اپنی حیرانی کا اظہار فرما رہے تھے کہ ابھی پرسوں تک تو مرحوم باتیں کر رہے تھے۔ گویا ان کے اپنے آداب جانکنی کی رو سے مرحوم کو مرنے سے تین چار سال پہلے چپ ہو جانا چاہئے تھا۔
بھلا مرزا ایسا موقع کہا خالی جانے دیتے تھے۔ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے۔ یاد رکھو! مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں نکلتا ہے۔
یوں تو مرزا کے بیان کے مطابق مرحوم کی بیوائیں بھی ایک دوسرے کی چھاتی پر دو ہتڑ مار مار کر بین کر رہی تھیں لیکن مرحوم کے بڑے نواسے نے جو پانچ سال سے بے روز گار تھا، چیخ چیخ کر اپنا گلا بٹھا لیا تھا۔ منشی جی بیری کے پتوں کا رس چوس چوس کر جتنا اسے سمجھاتے پچکارتے، اتنا ہی وہ مرحوم کی پنشن کو یاد کر کے دھاڑیں مار مار کر روتا۔ اسے اگر ایک طرف حضرت عزرائیل سے گلہ تھا کہ انہوں نے تیس تاریخ تک انتظار کیوں نہ کیا تو دوسری طرف خود مرحوم سے بھی سخت شکوہ تھا۔

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور؟

ادھر منشی جی کا سارا زور اس فلسفے پر تھا کہ برخوردار! یہ سب نظر کا دھوکہ ہے۔ درحقیقت زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں۔ کم از کم ایشیاء میں نیز مرحوم بڑے نصیبہ ور نکلے کہ دنیا کے بکھیڑوں سے اتنی جلد آزاد ہو گئے۔ مگر تم ہو کہ ناحق اپنی جوان جان کو ہلکان کئے جا رہے ہو۔ یونانی مثل ہے کہ:

وہی مرتا ہے جو محبوب خدا ہوتا ہے

حاضرین ابھی دل ہی دل میں حسد سے جلے جا رہے تھے کہ ہائے مرحوم کی آئی ہمیں کیوں نہ آ گئی کہ دم بھر کو بادل کے ایک

فالسئی ٹکڑے نے سورج کو ڈھک لیا اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ منشی جی نے یکبارگی بیری کے پتوں کا چھوک لگتے ہوئے اس کو مرحوم کے بہشتی ہونے کا غیبی شگون قرار دیا۔ لیکن مرزا نے بھرے مجمع میں سر ہلاہلا کر اس پیشگوئی سے اختلاف کیا۔ میں نے الگ لے جاکر وجہ پوچھی تو ارشاد ہوا۔

"مرنے کیلئے سنیچر کا دن بہت منحوس ہوتا ہے"۔

لیکن سب سے زیادہ پتلا حال مرحوم کے ایک دوست کا تھا جن کے آنسو کسی طرح تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے کہ انہیں مرحوم سے دیرینہ ربط و رفاقت کا دعویٰ تھا۔ اس روحانی یکجہتی کے ثبوت میں اکثر اس واقعے کا ذکر کرتے کہ بغدادی قاعدہ ختم ہونے سے ایک دن پہلے ہم دونوں نے ایک ساتھ سگرٹ پینا سیکھا۔ چنانچہ اس وقت بھی صاحب موصوف کے بین سے صاف ٹپکتا تھا کہ مرحوم کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت داغ بلکہ دغا دے گئے اور بغیر کہے سنے پیسہ چھڑا کے چپ چپاتے جنت الفردوس کو روانہ ہوگئے... اکیلے ہی اکیلے!

بعد میں مرزا نے صراحتاً بتایا کہ باہمی اخلاص و یگانگت کا یہ عالم تھا کہ مرحوم نے اپنی موت سے تین ماہ پیشتر موصوف سے دس ہزار روپے سکہ رائج الوقت بطور قرض حسنہ لئے اور وہ تو کہیے بڑی خیریت ہوئی کہ اسی رقم سے تیسری بیوی کا مہر معجل بیباق کرگئے ورنہ قیامت میں اپنے ساس سسر کو کیا منہ دکھاتے۔

--(۲)--

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ گنجان محلوں میں مختلف بلکہ متضاد تقریبیں ایک دوسرے سے بڑی خوبی سے ضم ہوجاتی ہیں۔ گویا دونوں وقت مل رہے ہوں۔ چنانچہ اکثر حضرات دعوت ولیمہ میں ہاتھ دھوتے وقت چلم کی بریانی کی ڈکار لیتے، یا سوئم میں شبینہ فتوحات کی لذیذ داستان سناتے پکڑے جاتے ہیں۔ لذت ہمسایگی کا یہ نقشہ بھی اکثر دیکھنے میں آیا کہ ایک کوارٹر میں ہنی مون منایا جارہا ہے تو رت جگا دیوار کے اس طرف ہورہا ہے اور یوں بھی ہوتا ہے کہ دائیں طرف والے گھر میں آدھی رات کو قوال بلبلیاں لڑا رہے ہیں تو حال بائیں طرف والے گھر میں آرہا ہے۔ آمدنی ہمسائے کی بڑھتی ہے تو اس خوشی میں ناجائز خرچ ہمارے گھر کا بڑھتا ہے اور یہ سانحہ بھی بارہا گزرا کہ مچھلی طرحدار پڑوسن نے پکائی اور:

مدتوں اپنے بدن سے تری خوشبو آئی

اس تقریبی گھپلے کا صحیح اندازہ مجھے دوسرے دن ہوا جب ایک شادی کی تقریب میں تمام وقت مرحوم کی وفات حسرت آیات کے تذکرے ہوتے رہے۔ ایک بزرگ نے کہ صورت سے خود پابہ رکاب معلوم ہوتے تھے، تشویشناک لہجے میں پوچھا، آخر ہوا کیا؟ جواب میں مرحوم کے ایک ہم جماعت نے اشاروں کنایوں میں بتایا کہ مرحوم جوانی میں اشتہاری امراض کا شکار ہوگئے۔ ادھیڑ عمر میں جنسی تونس میں مبتلا رہے لیکن آخری ایام میں تقویٰ ہوگیا تھا۔

"پھر بھی آخر ہوا کیا؟" پابہ رکاب بزرگ نے اپنا سوال دہرایا۔

"بھلے چنگے تھے۔ اچانک ایک ہچکی آئی اور جاں بحق ہوگئے۔" دوسرے بزرگ نے انگوچھے سے ایک فرضی آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"سنا ہے چالیس برس سے مرض الموت میں مبتلا تھے۔" ایک صاحب نے سوکھے سے منہ سے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"چالیس برس سے کھانسی میں مبتلا تھے اور آخر اسی میں انتقال فرمایا۔"

"صاحب! جنتی تھے کہ کسی اجنبی مرض میں نہیں مرے۔ ورنہ اب تو میڈیکل سائنس کی ترقی کا یہ حال ہے کہ روز ایک نیا مرض ایجاد ہوتا ہے۔"

"آپ نے گاندھی گارڈن میں اس بوہری سیٹھ کو کار میں چہل قدمی کرتے نہیں دیکھا جو کہتا ہے کہ میں ساری عمر دمے میں اتنی لاگت لگا چکا ہوں کہ اب اگر کسی اور مرض میں مرنا پڑا تو خدا کی قسم خودکشی کرلوں گا۔" مرزا چٹکلوں پر اتر آئے۔

"واللہ! موت ہو تو ایسی ہو! (سسکی) مرحوم کے ہونٹوں پر عالم سکرات میں بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔"

"اپنے قرض خواہوں کا خیال آرہا ہوگا۔" مرزا میرے کان میں پھسپھسائے۔

"گنہ گاروں کا منہ مرتے وقت سور جیسا ہوجاتا ہے، مگر چشم بددور۔ مرحوم کا چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔"

"صاحب! سلیٹی رنگ کا گلاب ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔" مرزا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ناک میرے کان کو چھونے لگی اور ان کے منہ سے کچھ ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے کوئی بچہ چکیلے فرنیچر پر گیلی انگلی رگڑ رہا ہو۔

اصل الفاظ تو ذہن سے محو ہوگئے لیکن اتنا اب بھی یاد ہے کہ انگوچھے والے بزرگ نے ایک فلسفیانہ تقریر کر ڈالی جس کا مفہوم کچھ ایسا ہی تھا کہ جینے کا کیا ہے۔ جینے کو تو جانور بھی جی لیتے ہیں لیکن جس نے مرنا نہیں سیکھا وہ جینا کیا جانے۔ ایک متبسم خودسپردگی، ایک بے تاب آمادگی کے ساتھ مرنے کیلئے ایک عمر کا ریاض درکار ہے۔ یہ بڑے ظرف، بڑے حوصلے کا کام ہے، بندہ نواز!

پھر انہوں نے بے موت مرنے کے خاندانی نسخے اور ہنستے کھیلتے اپنی روح قبض کرانے کے پینترے کچھ ایسے استادانہ تیور سے بیان کیے کہ ہمیں عطائی مرنے والوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نفرت ہوگئی۔

خاتمہ کلام اس پر ہوا کہ مرحوم نے کسی روحانی ذریعے سے سن گن پالی تھی کہ میں سنیچر کو مرجاؤں گا۔

"ہر مرنے والے کے متعلق یہی کہا جاتا ہے۔" باتصویر قمیض والا ٹیڈی بوائے بولا۔

"کہ وہ سنیچر کو مرجائے گا؟" مرزا نے اس بدلگام کا منہ بند کیا۔

انگوچھے والے بزرگ نے شئے مذکور سے پہلے اپنی نری کے جوتے کی گرد جھاڑی، پھر پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے مرحوم کے عرفان مرگ کی شہادت دی کہ جنت مکانی نے وصال سے ٹھیک چالیس دن پہلے مجھ سے فرمایا تھا کہ انسان فانی ہے!

انسان کے متعلق یہ تازہ خبر سن کر مرزا مجھے تخلیے میں لے گئے۔ دراصل تخلیے کا لفظ انہوں نے استعمال کیا تھا ورنہ جس جگہ وہ مجھے دھکیلتے ہوئے لے گئے وہ زنانے اور مردانے کی سرحد پر ایک چبوترہ تھا جہاں ایک میراثن گھونگٹ نکالے ڈھولک پر گالیاں گا رہی تھی۔ وہاں انہوں نے اس شغف کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جو مرحوم کو اپنی موت سے تھا مجھے آگاہ کیا کہ یہ ڈراما تو جنت مکانی اکثر کھیلا کرتے تھے۔ آدھی آدھی راتوں کو اپنی ہونے والی بیواؤں کو جگا کر دھمکیاں دیتے کہ میں اچانک اپنا سایہ تمہارے سر سے اٹھالوں گا۔ چشم زدن میں مانگ اجاڑ دوں گا۔ اپنے بے تکلف دوستوں سے بھی کہا کرتے کہ واللہ! اگر خودکشی جرم نہ ہوتی تو کبھی کا اپنے گلے میں پھندا ڈال لیتا۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ اپنے آپ کو مردہ تصور کرکے ڈکرانے لگتے اور چشم تصور سے منجھلی کے سونے سے ہاتھ دیکھ کر کہتے: "بخدا میں تمہارا رنڈاپا نہیں دیکھ سکتا۔" مرنے والے کی ایک ایک خوبی بیان کرکے خشک سسکیاں بھرتے اور سسکیوں کے درمیان سگرٹ کو کش لگاتے اور جب اس عمل سے اپنے اوپر رقت طاری کرلیتے تو رومال سے بار بار آنکھ کے بجائے اپنی ڈبڈبائی ہوئی ناک پونچھتے جاتے۔ پھر جب شدت گریہ سے ناک سرخ ہوجاتی تو ذرا صبر آتا اور وہ عالم تصور میں اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے تینوں بیواؤں

کی مانگ میں یکے بعد دیگرے ڈھیروں افشاں بھرتے۔ اس سے فارغ ہو کر ہر ایک کو کہنیوں تک مہین مہین پھنسی پھنسی چوڑیاں پہناتے (بیاہتا کو چار چوڑیاں کم پہناتے تھے۔)

حالانکہ اس سے پہلے بھی مرزا کو کئی مرتبہ ٹوک چکا تھا کہ خاقانی ہند استاد ذوق ہر قصیدے کے بعد منہ بھر بھر کر کلیاں کیا کرتے تھے۔ تم پر ہر کلمے، ہر فقرے کے بعد واجب ہیں لیکن اس وقت مرحوم کے بارے میں یہ اول جلول باتیں اور ایسے واشگاف لہجے میں سن کر میری طبیعت کچھ زیادہ ہی منغض ہو گئی۔ میں نے دوسروں پر ڈھال کر مرزا کو سنائی۔

"یہ کیسے مسلمان ہیں مرزا! دعائے مغفرت نہیں کرتے نہ کریں۔ مگر ایسی باتیں کیوں بناتے ہیں یہ لوگ؟"

"خلق خدا کی زبان کس نے پکڑی ہے۔ لوگوں کا منہ تو چہلم کے نوالے ہی سے بند ہوتا ہے۔"

--(۳)--

مجھے چہلم میں بھی شرکت کا اتفاق ہوا لیکن سوائے ایک نیک طینت مولوی صاحب کے جو پلاؤ کے چاولوں کی لمبائی اور گلاوٹ کو مرحوم کے ٹھیٹ جنتی ہونے کی نشانی قرار دے رہے تھے بقیہ حضرات کی گل افشانی گفتار کا وہی انداز تھا۔ وہی جگ جگے تھے، وہی چہچہے!

ایک بزرگوار جو نان قورمے کے ہر آتشیں لقمے کے بعد آدھا آدھا گلاس پانی پی کر قبل از وقت سیر بلکہ سیراب ہو گئے تھے، منہ لال کر کے بولے کہ مرحوم کی اولاد نہایت ناخلف نکلی۔ مرحوم و مغفور شد و مد سے وصیت فرما گئے تھے کہ میری مٹی بغداد لے جائی جائے لیکن نافرمان اولاد نے ان کی آخری خواہش کا ذرا پاس نہ کیا۔

اس پر ایک منہ پھٹ پڑوسی بول اٹھے "صاحب! یہ مرحوم کی سراسر زیادتی تھی کہ انہوں نے خود تو تادم مرگ میونسپل حدود سے قدم باہر نہیں نکالا۔ حد یہ کہ پاسپورٹ تک نہیں بنوایا اور..."

ایک وکیل صاحب نے قانونی موشگافی کی۔ "بین الاقوامی قانون کے بموجب پاسپورٹ کی شرط صرف زندوں کے لیے ہے۔ مردے پاسپورٹ کے بغیر بھی جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔"

"لے جائے جا سکتے ہیں" مرزا پھر لقمہ دے گئے۔

"میں کہہ یہ رہا تھا کہ یوں تو ہر مرنے والے کے سینے میں یہ خواہش سلگتی رہتی ہے کہ میرا کانسی کا مجسمہ (جسے قد آدم بنانے کے لیے بسا اوقات اپنی طرف سے پورے ایک فٹ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے) میونسپل پارک کے بیچوں بیچ استادہ کیا جائے اور..."

"اور جملہ نازنینان شہر چار مہینے دس دن تک میرے لاشے کو گود میں لئے بال بکھرائے بیٹھی رہیں۔" مرزا نے دوسرا مصرع لگایا۔

"مگر صاحب! وصیتوں کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ہمارے بچپن کا قصہ ہے۔ پیپل والی حویلی کے پاس ایک جھونپڑی میں ۳۹ء تک ایک افیمی رہتا تھا۔ ہمارے محتاط اندازے کے مطابق عمر ۶۶ سال سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔ اس لئے کہ خود کہتا تھا کہ پینسٹھ سال سے تو افیم کھا رہا ہوں۔ چوبیس گھنٹے اشا عفیل رہتا تھا۔ ذرا نشہ ٹوٹتا تو مغموم ہو جاتا۔ غم یہ تھا کہ دنیا سے بے اولاد جا رہا ہوں۔ اللہ نے کوئی اولاد نرینہ نہ دی جو اس کی بان کی چارپائی کی جائز وارث بن سکے! اس کے متعلق محلے میں مشہور تھا کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے نہیں نہایا ہے۔ اس کو اتنا تو ہم نے بھی کہتے سنا کہ خدا نے پانی صرف پینے کیلئے بنایا تھا مگر انسان بڑا ظالم ہے۔

راحتیں اور بھی ہیں غسل کی راحت کے سوا

ہاں تو صاحب! جب اس کا دم آخر ہونے لگا تو محلے کی مسجد کے امام کا ہاتھ اپنے ڈوبتے دل پر رکھ کر یہ قول و قرار کیا کہ میری میت

کو غسل نہ دیا جائے ۔ بس پولے پولے ہاتھوں سے تیمم کرا کے کفنا دیا جائے ورنہ حشر میں دامن گیر ہوں گا ۔"

وکیل صاحب نے تائید کرتے ہوئے فرمایا "اکثر مرنے والے اپنے کرنے کے کام پسماندگان کو سونپ کر ٹھنڈے سدھار جاتے ہیں ۔ پچھلی گرمیوں میں دیوانی عدالتیں بند ہونے سے چند یوم قبل ایک مقامی شاعر کا انتقال ہوا ۔ واقعہ ہے کہ ان کے جیتے جی کسی فلمی رسالے نے بھی ان کی عریاں نظموں کو شرمندہ طباعت نہ کیا لیکن آپ کو حیرت ہوگی کہ مرحوم اپنے بھتیجے کو ایصال ثواب کی یہ راہ سجھا گئے کہ بعد مردن میرا کلام حنائی کاغذ پر چھپوا کر سال کے سال میری برسی پر فقیروں اور مدیروں کو بلاہدیہ تقسیم کیا جائے ۔

پڑوسی کی ہمت اور بڑھی "اب مرحوم ہی کو دیکھئے ۔ زندگی میں ہی ایک قطعہ اراضی اپنی قبر کیلئے بڑے ارمانوں سے رجسٹری کرالیا تھا گو کہ بچارے اس کا قبضہ پورے بارہ سال بعد لے پائے ۔ نصیحتوں اور وصیتوں کا یہ عالم تھا کہ موت سے دس سال پیشتر اپنے نواسوں کے ایک فہرست حوالے کردی تھی جس میں نام بنام لکھا تھا کہ فلاں ولد فلاں کو میرا منہ نہ دکھایا جائے ۔ (جن حضرات سے زیادہ آزردہ خاطر تھے ان کے نام کے آگے ولدیت نہیں لکھی تھی) تیسری شادی کے بعد انہیں اس کا طویل ضمیمہ مرتب کرنا پڑا جس میں تمام جوان پڑوسیوں کے نام شامل تھے ۔"

"ہم نے تو یہاں تک سنا ہے کہ مرحوم نہ صرف اپنے جنازے میں شرکاء کی تعداد متعین کر گئے بلکہ آج کے چہلم کا "مینو" بھی خود ہی طے فرما گئے تھے ۔" وکیل نے خاکے میں شوخ رنگ بھرا ۔

اس نازک مرحلے پر خشخشی داڑھی والے بزرگ نے پلاؤ سے سیر ہو کر اپنے شکم پر ہاتھ پھیرا اور "مینو" کی تائید و توصیف میں ایک مسلسل ڈکار داغی جس کے اختتام پر اس معصوم حسرت کا اظہار فرمایا کہ کاش آج مرحوم زندہ ہوتے تو یہ انتظامات دیکھ کر کتنے خوش ہوتے !

اب پڑوسی نے تیغ زبان کو بے نیام کیا " مرحوم سدا سے سوءہضم کے مریض تھے ۔ غذا تو غذا بچارے کے پیٹ میں بات تک نہیں ٹھہرتی تھی ۔ چٹ پٹی چیزوں کو ترستے ہی مرے ۔ میرے گھر میں سے بتارہی تھیں کہ ایک دفعہ ملیریا میں سرسام ہوگیا اور لگے بہکنے ۔ باربار اپنا سر منجھلی کے زانوں پر پٹختے اور سہاگ کی قسم دلاکر یہ وصیت کرتے تھے کہ ہر جمعرات کو میری فاتحہ ، چاٹ اور کنواری بکری کی بسری پر دلوائی جائے ۔"

مرزا پھڑک ہی تو گئے ۔ ہونٹ پر زبان پھیرتے ہوئے بولے "صاحب ! وصیتوں کی کوئی حد نہیں ۔ ہمارے محلے میں ڈیڑھ پونے دو سال پہلے ایک اسکول ماسٹر کا انتقال ہوا جنہیں میں نے عید بقرعید پر بھی سالم و ثابت پاجامہ پہنے نہیں دیکھا ۔ مگر مرنے سے پہلے وہ بھی اپنے لڑکے کو ہدایت کر گئے کہ

پل بنا ، چاہ بنا ، مسجد و تالاب بنا !

لیکن حضور ابا کی آخری وصیت کے مطابق فیض کے اسباب بنانے میں لڑکے کی مفلسی کے علاوہ ملک کا قانون بھی مزاحم ہوا ۔"

"یعنی کیا ؟" وکیل صاحب کے کان کھڑے ہوئے ۔

"یعنی یہ کہ آج کل پل بنانے کی اجازت صرف پی ڈبلیو ڈی کو ہے اور بالفرض محال کراچی میں چار فٹ گہرا کنواں کھود بھی لیا تو پولیس اس کا کھاری کیچڑ پینے والوں کا چالان اقدام خودکشی میں کردے گی ۔ یوں بھی پھٹیچر سے پھٹیچر قصبے میں آج کل کنویں صرف ایسے ویسے موقعوں پر ڈوب مرنے کے لیے کام آتے ہیں ۔ رہے تالاب ، تو حضور ! لے دے کے ان کا یہ مصرف رہ گیا ہے کہ دن بھر ان میں گاؤں کی بھینسیں نہائیں اور صبح جیسی آئی تھیں اس سے کہیں زیادہ گندی ہو کر چراغ جلے باڑے میں پہنچیں ۔

خدا خدا کرکے یہ مکالمہ ختم ہوا تو پٹاخوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔
"مرحوم نے کچھ چھوڑا بھی؟"
"بچے چھوڑے ہیں!"
"مگر دوسرا مکان بھی تو ہے۔"
"اس کے کرایے کو اپنے مزار کی سالانہ مرمت سفیدی کے لیے وقف کرگئے ہیں۔"
"پڑوسیوں کا کہنا ہے کہ بیاہتا بیوی کے لیے ایک انگوٹھی بھی چھوڑی ہے۔ اگر اس کا نگینہ اصلی ہوتا تو کسی طرح بیس ہزار سے کم کی نہیں تھی۔"
"تو کیا نگینہ جھوٹا ہے؟"
"جی نہیں۔ اصلی امی ٹیشن ہے!"
"اور وہ پچاس ہزار کی انشورنس پالیسی کیا ہوئی؟"
"وہ پہلے ہی منجھلی کے مہر میں لکھ چکے تھے۔"
"اس کے بارے میں یار لوگوں نے لطیفہ گھڑ رکھا ہے کہ منجھلی بیوہ کہتی ہے کہ سرتاج کے بغیر زندگی اجیرن ہے۔ اگر کوئی ان کو دوبارہ زندہ کردے تو میں بخوشی دس ہزار لوٹانے پر تیار ہوں۔"
"ہم نے خانگی ذرائع سے سنا ہے کہ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، مرحوم منجھلی پر ایسے لٹلوٹ تھے کہ اب بھی رات برات، خوابوں میں آآکر ڈراتے ہیں۔"
"مرحوم اگر ایسا کرتے ہیں تو بالکل ٹھیک کرتے ہیں۔ ابھی تو ان کا کفن بھی میلا نہیں ہوا ہوگا۔ مگر سننے میں آیا ہے کہ منجھلی نے رنگے چنے دوپٹے اوڑھنا شروع کردیا ہے۔"
"اگر منجھلی ایسا کرتی ہے تو بالکل ٹھیک کرتی ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک زمانے میں لکھنؤ کے نچلے طبقے میں یہ رواج تھا کہ چالیسویں پر نہ صرف انواع و اقسام کے پرتکلف کھانوں کا اہتمام کیا جاتا بلکہ بیوہ بھی سولہ سنگھار کرکے بیٹھتی تھی تاکہ مرحوم کی ترسی ہوئی روح کماحقہ مستفیض ہوسکے۔" مرزا نے ح اور ع صحیح مخرج سے ادا کرتے ہوئے مرے پر آخری درہ لگایا۔
واپسی پر راستے میں میں نے مرزا کو آڑے ہاتھوں لیا۔ جمعہ کو تم نے وعظ نہیں سنا؟ مولوی صاحب نے کہا تھا کہ مرے ہوؤں کا ذکر کرو تو اچھائی کے ساتھ۔ موت کو نہ بھولو کہ ایک نہ ایک دن سب کو آنی ہے۔"
سڑک پار کرتے کرتے ایک دم بیچ میں اکڑ کر کھڑے ہوگئے۔ فرمایا "اگر کوئی مولوی یہ ذمہ لے لے کہ مرنے کے بعد میرے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ لکھا جائے گا تو آج ہی... اسی وقت، اسی جگہ مرنے کے لئے تیار ہوں۔ تمہاری جان کی قسم!"
آخری فقرہ مرزا نے ایک بے صبری کار کے بمپر پر تقریباً اکڑوں بیٹھ کر جاتے ہوئے ادا کیا۔☆

جولائی ۱۹۶۱ء

مطبوعہ "خاکم بہ دہن"

مشتاق احمد یوسفی

حاجی اورنگ زیب خاں

سوداگران و آڑھتیان چوب ہائے عمارتی

پتلا شوربہ اور سوجی کا حلوہ:

ابھی مولانا کرامت حسین کے وظیفے کو چالیس دن نہیں ہوئے تھے کہ بشارت ایک اور قضیے میں الجھ گئے۔ جو کچھ اس طرح تھا کہ حاجی اورنگ زیب خاں، آڑھتیان و سوداگران چوب ہائے عمارتی، پشاور ان سے رقم وصول کرنے آدھمکے۔ انہوں نے کوئی ایک سال قبل اعلیٰ درجہ کی لکڑی پنجاب کے ایک آڑھتی کی معرفت بشارت کو سپلائی کی تھی۔ یہ داغدار نکلی۔ جب یہ سال بھر تک نہیں بکی تو بشارت نے گھاٹے سے سات ہزار میں فروخت کردی۔ یہ وہی لکڑی تھی جس کی چوری، بازیابی اور غربود ہونے کا حال ہم پچھلے صفحات میں بیان کرچکے ہیں۔ بشارت کا موقف تھا کہ میں نے یہ لکڑی سات ہزار میں، گھاٹے سے بیچی۔ خان صاحب فرماتے تھے کہ آپ کی آدھی لکڑی تو چور لے گئے۔ آدھی پولیس والوں نے ہتھیالی۔ آپ اسے بیچنا کہتے ہیں۔ اس کے لیے تو پشتو میں بہت برا لفظ ہے۔

بشارت کے تخمینے کے مطابق لکڑی کی مالیت کسی طرح سات ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ ادھر حاجی اورنگ زیب خاں اصولی طور پر ایک پائی بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے، جس کا مطلب یہ تھا کہ بشارت بقیہ رقم یعنی ۲۔۹۔۲۵۴۳ روپے اپنی گرہ سے بھریں۔ (یہ رقم آج کے پندرہ ہزار روپے کے برابر تھی) خان صاحب کہتے تھے کہ آپ نے مال بیچنے میں شیطانی عجلت سے کام لیا۔ جلدی کام شیطان کا۔ "صیب! یہ لکڑی تھی بالغ لڑکی تو نہیں جس کی جلد از جلد رخصتی کرنا کارِ ثواب ہو"۔

ایک مدت سے اس رقم کے بارے میں خط و کتابت ہورہی تھی۔ ایک دن خان صاحب کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ قانونی نوٹس کی رجسٹری کرائی اور پشاور جنرل پوسٹ آفس سے سیدھے گھر آئے۔ سامان باندھا اور نوٹس سے پہلے خود کراچی پہنچ گئے۔ نوٹس ان کی آمد کے تین دن بعد ان کی موجودگی میں اسطرح موصول ہوا کہ رجسٹری خود انہوں نے ڈاکیے کے ہاتھ سے چھین کر کھولی۔ نوٹس نکال کر پھاڑ دیا اور لفافہ بشارت کو تھمادیا۔ قیام بھی انہی کے ہاں کیا۔ اس زمانے میں دستور تھا کہ آڑھتی یا تھوک بیوپاری آئے تو اسے گھر پر ہی ٹھہرایا جاتا تھا۔ یوں بھی بشارت کی خان صاحب سے خوب بنتی تھی۔ بشارت خان صاحب کے خلوص و مدارات کے گرویدہ اور خان صاحب ان کی لچھے دار باتوں کے دلدادہ۔

دن بھر ایک دوسرے کے ساتھ جھائیں جھائیں کرنے کے بعد، شام کو خان صاحب بشارت کے ساتھ ان کے گھر چلے جاتے۔ جہاں ان کی اس طرح خاطر مدارات ہوتی جیسے دن میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ گھر والے ان کی خاطر داریاں کرتے کرتے تنگ آچکے تھے۔ اس کے باوجود خاں صاحب شاکی تھے کہ کراچی میں پتلے شوربے کا سالن کھا کھا کے میری نظر کمزور ہوگئی ہے۔ قدرے لنگڑا کر چلنے لگے تھے۔ فرماتے تھے، گھٹنوں میں شوربہ اتر آیا ہے۔ رات کے کھانے کے بعد سوجی کا حلوہ ضرور طلب کرتے۔ فرماتے تھے، حلوہ نہ کھاؤں تو

بزرگوں کی روحیں خواب میں آ آ کر ڈانٹتی ہیں۔ اکثر ان سالم رانوں کو یاد کر کے آہیں بھرتے جو ان کے دستر خوان کی زینت ہوا کرتی تھیں۔ ان کا پیٹ اعلیٰ نسل کے بروں (دنبوں) کا قبرستان تھا۔ جس کے وہ مجاور تھے۔ بشارت نے دوپہر کو ان کے لیے فرنٹیئر ہوٹل سے ران اور چپلی کباب منگانے شروع کئے۔ مرزا نے کئی مرتبہ کہا کہ اس سے تو بہتر ہے کہ ۹۔۲۔۲۵۷۳ روپے دے کر اپنا پنڈ چھڑاؤ۔ یہ پھر بھی سستا پڑے گا۔ مگر بشارت کہتے تھے کہ سوال روپے کا نہیں، اصول کا ہے۔ خان صاحب بھی اسے اپنی انا اور اصول کا مسئلہ بنائے ہوئے تھے۔

اولیاء اللہ جس یکسوئی اور استغراق سے مراقبہ اور خدا کی عبادت کرتے ہیں، خان صاحب اس سے زیادہ یکسوئی اور استغراق غذا پر صرف کرتے تھے۔ اکثر فرماتے کہ نماز، نیند، کھانے اور گالی دینے کے دوران کوئی مخل ہوجائے تو اسے گولی مار دوں گا۔ کسی اجنبی یا دشمن یا ناقابل اعتبار دوست سے ملنے جاتے تو گلے میں ۳۸ بور کا ریوالور حمائل کرلیتے۔ مشہور تھا کہ خانہ کعبہ کے طواف کے دوران بھی ریوالور احرام میں چھپا رکھا تھا۔ واللہ اعلم۔ دس سیر سوجی روے دار بطور سوغات کراچی لائے تھے۔ اسی کا حلوہ بنوا بنوا کر کھا رہے تھے۔ بشارت روز سوجی کی بوری دیکھتے اور دہل جاتے اس لیے کہ ابھی تو اس کے ختم ہونے میں بہت دیر تھی۔ خان صاحب فرماتے تھے کہ اگلی دفعہ مردان شوگر ملز سے تازہ گڑ کی بوری لاؤں گا۔ سفید چینی کھانے سے خون پتلا پڑ جاتا ہے۔ ایک دن بشارت نے اندیشہ ہائے قریب سے گھبرا کر باتوں باتوں میں ٹوہ لینا چاہی۔ پوچھا "خان صاحب گڑ سے کیا کیا بنتا ہے؟" سوجی کے حلوے کا گولا حلق میں پھسلاتے ہوئے بولے "بھائی سے پوچھ لینا اس وقت دماغ حاضر نہیں۔ بات یہ ہے کہ گھاٹے اور جھگڑے سے اور گڑ سے .... اور روزے سے بھی .... ہمارے دماغ کو ایک دم گرمی چڑھ جاتا ہے۔ ہم صرف رمضان میں ہاتھا پائی کرتا ہے۔ اس واسطے کہ روزے میں گالی دینا منع ہے"۔

ٹانگیں اور پائے:

خان صاحب کے اپنے دستر خوان اور خاطر مدارات کا کیا کہنا۔ بشارت کو پشاور میں ان کے ہاں مہمان رہنے کا اتفاق ہوا۔ ہر کھانے پر بکری یا دنبے کی مسلم ران سامنے رکھ دیتے۔ ناشتے اور چائے پر البتہ مرغی کی ٹانگ پر اکتفا کرتے۔ ان کے دستر خوان پر ران اور ٹانگ کے سوا کسی اور حصے کا گوشت نہیں دیکھا۔ نہ کبھی سبزی یا مچھلی دیکھی، جس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی تھی کہ بینگن اور مچھلی کی ٹانگیں نہیں ہوتیں۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ پیرس کے Folies Bergere اور Lido کی کورس گرلز کا Legs Show دیکھ کر خان صاحب پشتو میں کیا ارشاد فرماتے لیکن اتنا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ انہیں ایسی ٹانگوں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی جنہیں روسٹ کر کے وہ کھا اور کھلا نہ سکیں۔

ٹانگ کے گوشت سے رغبت کے باوجود خان صاحب کو کراچی کی بونگ کی نہاری اور سری پایوں سے سخت چڑ تھی۔ ایک مرتبہ فرمایا، مجھ سے تو مواشی کے گندے، گوبر میں لبے ہوئے کھروں کا آب جوش نہیں کھایا جاتا۔ ہمارے فرنٹیر میں تو کوئی بڈھا کسی کچی عمر کی دوشیزہ سے شادی کرلے تو حکیم اور پڑوسی اسے ایسا ہی آتش گیر مادہ کھلاتے ہیں۔ اس سے وہ انتڑیوں کی بیماری میں مبتلا ہو کر وفات پاجاتا ہے۔ سنا ہے ولایت میں تو کھروں سے سالن کے بجائے سریش بناتے ہیں۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بکری کے پائے۔ بھیڑ کے پائے۔ دنبے کے پائے۔ گائے کے پائے۔ بیل کے پائے۔ بھینسے کے پائے۔ میں تو جانوں چارپائی کے پائے آپ محض اس لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ صاف ہوتے ہیں۔

پچھلی صدی کا اسٹیچو:

خان صاحب وجیہہ اور بھاری بھر کم آدمی تھے ۔ ان کی لغویات میں بھی وزن محسوس ہوتا تھا ۔ قد تقریباً ساڑھے چھ فٹ، جسے کلاہ اور طرے سے ساڑھے سات فٹ بنا رکھا تھا ۔ مگر آٹھ فٹ کے لگتے تھے اور یہی سمجھ کر بات کرتے تھے ۔ صحت اور کاٹھی اتنی اچھی کہ عمر کچھ بھی ہو سکتی تھی ۔ تن و توش کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہتھے والی کرسی پر جیسے تیسے ٹھنس کر بیٹھ تو جاتے لیکن جب اٹھتے تو کرسی بھی ساتھ اٹھتی ۔ سنہری مونچھیں اور ہلکی براؤن آنکھیں ۔ بائیں رخسار پر زخم کا ہلالی نشان جو اگر نہ ہوتا تو چہرہ ادھورا دکھائی دیتا ۔ انگشت شہادت دوسری پور سے کٹی ہوئی ۔ کسی نابکار کو خبردار کرنا ہو، یا آسمان کو کسی قضیے میں اپنا گواہ بنانا مقصود ہو (جس کی ضرورت دن میں کئی بار پڑتی تھی) تو یہ نیم انگشت انتباہ اٹھا کر خطاب کرتے ۔ ان کی کٹی انگلی بھی ہماری ثابت انگلی سے بڑی تھی ۔ پاس اور دور کی نظر خاصی کمزور تھی، لیکن عینک لگانے سے حتی الامکان احتراز کرتے ۔ صرف چیک پر دستخط کرنے اور گالی دینے کے بعد معتوب کے چہرے پر اس کے اثرات دیکھنے کے لیے پاس کی عینک لگالیتے اور اتارنے سے پہلے جلدی جلدی اسی سے دور کی چیزیں دیکھنے کی کوشش کرتے ۔ یہ معلومات ان کی دن بھر کی جغرافیائی ضروریات کے لیے کافی ہوتی تھیں ۔ آنکھوں میں شوخی کی ہلکی سی تحریر ۔ کھل کر ہنستے تو چہرہ انار دانہ ہو جاتا ۔ چہرے پر ہنسی ختم ہونے کے بعد اس کی اندرونی لہروں سے پیٹ دیر تک ہچکولے کھاتا رہتا ۔ اصلی زری کی کلاہ پر پگڑی کا ہاتھ بھر اونچا کلف دار طرہ زخمی انگوٹھے کی طرح ہر وقت کھڑا ہی رہتا تھا ۔ گہرا براؤن ٹرکش کوٹ ۔ "تلے" کا پشاوری چپل جس میں ہمارے دونوں پیر آگے پیچھے آجائیں ۔ لامتناہی گھیر کی سفید شلوار ۔ خان صاحب نہایت بارعب، جامہ زیب پچھلی صدی کے آدمی دکھلائی دیتے تھے ۔ قصیدے، کیری کیچور (Caricature ہم اس کا ترجمہ مسخاکہ کریں گے یعنی مسخ خاکہ) ۔ اور اسٹیچو (مجسمہ) کے لیے یہ از بس لازم ہے کہ کم از کم ڈیوڑھے ہوں ۔ لائف سائز نہ ہوں ۔ خان صاحب اپنا اسٹیچو آپ تھے ۔

واسکٹ کی جیب میں جو طلائی گھڑی رکھتے تھے اس کی زنجیر دو فٹ لمبی ضرور ہوگی ۔ اس لیے کہ واسکٹ کی ایک جیب سے دوسری جیب کا فاصلہ اتنا ہی تھا ۔ جتنی دیر میں خان صاحب کی شلوار میں کمر بند ڈلتا، اتنی دیر میں آدمی حیدرآباد ہو کر آسکتا تھا ۔ اعصاب اس حد تک مضبوط تھے کہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تھے ہی نہیں ۔ معمولی تکلیف اور ناراحتی کا ان کو احساس ہی نہیں ہوتا تھا ۔ ایک دفعہ دھوبی نے ان کی میلی شلوار کے نیفے میں سے پنسل کے ٹکڑے برآمد کیے ۔ پرخور تھے ۔ دوران طعام، کلام سے پرہیز کرتے اور پانی نہیں پیتے تھے کہ خواہ مخواہ جگہ گھیرتا ہے ۔ دال کو ہندو دانہ بدعت اور سبزی کھانے کو مویشیوں کی صریح حق تلفی سمجھتے تھے ۔ کڑاہی گوشت کا مطلب صرف یہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کڑاہی گوشت کھائیں گے، بلکہ کڑاہی بھر کے کھائیں گے ۔ خیریت گزری کہ اس زمانے میں بالٹی گوشت کا رواج نہیں تھا، ورنہ وہ یقیناً بالٹی کو کڑاہی پر ترجیح دیتے ۔ تیتر بٹیر کی ہڈیوں، انگور، مالٹے اور تربوز کے بیج تھوکنے کو زنانی نزاکتوں میں شمار کرتے تھے ۔ اپنے تن و توش اور ہیئت کذائی (جسے ہیئت غذائی کہنا بہتر ہوگا) سے خود عاجز تھے ۔ گھومنے پھرنے اور چہل قدمی کے شوقین، مگر اس شرط پر کہ ہر چالیس قدم کے بعد سستانے اور کچھ پیٹ میں ڈالنے کے لیے توقف فرمائیں گے تاکہ تازہ دم ہو کر آگے بڑھیں ۔ یعنی اگلے چالیس قدم ۔ مانا کہ خان صاحب میں اتنی پھرتی اور چلت پھرت نہ تھی کہ بڑھ کر دشمن پر حملہ کر سکیں ۔ لیکن ہنگام قتال اگر وہ اس پر صرف گر پڑتے تو وہ پانی نہ مانگتا ۔ ہاتھ پاؤں مارے بغیر وہیں دم گھٹ کر ڈھیر ہو جاتا ۔ کراچی اگاہی کے لیے تشریف لاتے تو کارتوسوں کی پیٹی نہیں باندھتے تھے ۔ فرماتے تھے اس کے بغیر ہی کام چل جاتا ہے ۔ سینے اور پیٹ پر پیٹی کے نشان سے ایک ڈایاگنل (اریب لکیر) بن گئی تھی جو دھڑ کو دو مساوی مثلثوں میں آڑا تقسیم کرتی تھی ۔ فرماتے تھے، جہاں کوہستانی ہوائیں اور بندوق کی آواز نہ آئے وہاں مردوں کو نیند نہیں آتی ۔

ان کی کٹی ہوئی انگشت شہادت کا قصہ یہ ہے کہ ان کا لڑکپن تھا۔ لڑکوں میں لیمونیڈ کی گولی والی بوتل کو انگلی سے کھولنے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ خان صاحب نے اس کی گولی پر انگشت شہادت رکھ کر دوسرے ہاتھ سے پوری طاقت سے مکا مارا جس سے فی الفور بوتل اور ہڈی ٹوٹ گئی۔ بوتل کی گردن ان کی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی کی طرح پھنس کر رہ گئی۔ ہتھوڑے سے توڑنی پڑی۔ انگلی سیپٹک ہو گئی۔ دو ہفتے بعد کٹوانی پڑی۔ کلوروفارم سونگھنے کو وہ مردوں کی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ لہذا بغیر کلوروفارم کے آپریشن کرایا۔ آپریشن سے پہلے کہا کہ میرے منہ پر کس کے ڈھاٹا باندھ دو۔

اپنی دانست میں کوئی بہت ہی عالمانہ نکتہ بیان کرنا ہوتا تو بات میں وزن اور وقار پیدا کرنے کی غرض سے پہلے اپنی ٹھوڑی پر اس طرح ہاتھ پھیرتے گویا وہاں ٹیگور جیسی داڑھی ہے جو منت پذیر شانہ ہے۔ پھر نیم بریدہ انگشت شہادت سوئے فلک اٹھاتے اور پڑھنے کی عینک لگا کر جملہ شروع کرتے۔ لیکن گمبھیر اور گنجلک جملے کے ادھ بیچ میں کوئی شوخ بات یا چنچل فقرہ اچانک ذہن میں کوند جاتا تو اسے ادا کرنے سے پہلے آنکھ مارتے۔ اور آنکھ مارنے سے پہلے عینک اتار لیتے تاکہ دیکھنے والوں کو صاف نظر آئے۔

ان کی ہنسی کی تصویر کھینچنا بہت مشکل ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بڑے زور سے ایک لمبا قہقہہ لگانا چاہتے ہیں، مگر بوجوہ اسے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے منہ سے بڑی دیر تک ایسی آوازیں نکلتی رہتیں جیسے بیٹری خلاص ہونے کے بعد کار کو بار بار اسٹارٹ کرنے سے نکلتی ہیں۔ ہنسنے سے پہلے بالعموم اپنی واسکٹ کے بٹن کھول دیتے تھے کہتے تھے پردیس میں روز روز کس سے بٹن ٹکواؤں۔

شادی ایک ہی کی۔ یک گیرد محکم گیر کے قائل تھے۔ بیوی نے عاجز آکر کئی بار ان سے کہا کہ دوسری کر لو، تاکہ اوروں کو بھی تو چانس ملے۔

لنگڑے کا کروچ سے شیخ سعدی تک:

آپ چاہیں تو خان صاحب کو ان پڑھ کہہ سکتے ہیں، مگر اَن گھڑ یا جاہل ہرگز نہیں۔ رچی بسی طبیعت، بلا کی سوجھ بوجھ اور نظر رکھتے تھے جو فوراً بات کی تہ تک پہنچ جاتی تھی۔ صحیح معنوں میں شائستہ حیات تھے کہ انہوں نے انسان اور زندگی کو ہر رنگ میں سہارا اور برتا تھا۔ کتاب کے مسخائینے (مسخائینہ مسخ کرنے والا آئینہ Distorting Mirror کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے) اور آرٹ کے آرائشی فریم میں نہیں دیکھا تھا۔ خود زندگی جو کچھ دکھاتی، سکھاتی اور پڑھاتی ہے وہ سیدھا دل پر رقم ہوتا ہے۔

نظیر سیکھے سے علم رسمی بشر کی ہوتی ہیں چار آنکھیں
پڑھے سے جس کے ہوں لاکھ آنکھیں وہ علم دل کی کتاب میں ہے

عرفی نے اپنے آپ کو "آموز گار خود" کہا تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کہا تھا۔ خان صاحب مدرسہ حیات کے منتہیوں اور فارغین میں سے تھے۔

خان صاحب برسوں چیک پر انگوٹھا لگاتے رہے۔ لیکن جس دن ان کا بینک بیلنس ایک لاکھ ہو گیا انہوں نے اردو میں دستخط کرنے سیکھ لیے۔ فرماتے تھے، انگوٹھا لگا لگا کر سود خور بینکوں سے اوور ڈرافٹ لینے میں تو کوئی ہرج نہیں، پر حلال کی کمائی کی رقم سوچ سمجھ کر نکالنی چاہیے۔ دستخط کیا تھے، لگتا تھا کوئی لنگڑا کاکروچ دوات میں غسل کر کے کاغذ پر سے گزر گیا ہے۔ دستخط کے دوران ان کا ہاتھ ایسی توڑ مروڑ سے گزرتا اور ہر چھوٹا بڑا دائرہ بناتے وقت ان کے کھلے ہوئے منہ کی گولائی اس طرح گھٹتی بڑھتی کہ ایک ہی دستخط کے بعد ان کے ہاتھ اور دیکھنے والے کی آنکھ میں باؤٹا آجاتا! اس زمانے میں خان صاحب کا اکاؤنٹ مسلم کمرشیل بینک، چوک یادگار برانچ میں تھا، جہاں اردو میں دستخط کرنے والوں کو اسٹامپ کاغذ پر یہ تومین آمیز Indemnity (ضمانت) دینی پڑتی تھی کہ اگر ان کے

اکاونٹ میں جعلی دستخطوں کے سبب کوئی فراڈ ہوجائے تو بینک ذمہ دار نہ ہوگا۔ بلکہ اگر اس کے نتیجے میں بینک کو کوئی نقصان بالواسطہ یا بلاواسطہ پہنچے تو اسے بھی وہی بھریں گے۔ خان صاحب کو جب اس کا مطلب پشتو میں سمجھایا گیا تو مشتعل ہوگئے۔ اردو بولنے والے اکاونٹنٹ سے کہنے لگے کہ ایسی بیہودہ شرط ماننے والے کے لیے پشتو میں بہت برا لفظ ہے۔ ہمارا دل بہت خفا ہے۔ بکتے جھکتے بینک کے انگریز مینیجر مسٹر اے میکلین (جو راقم الحروف کا باس رہ چکا تھا) کے پاس احتجاج کرنے گئے۔ کہنے لگے کہ میرے دستخط اتنے خراب ہیں کہ کوئی تعلیم یافتہ آدمی بنا ہی نہیں سکتا۔ جب میں خود اپنے دستخط اتنی مصیبت سے کرتا ہوں تو دوسرا کیسے بنا سکتا ہے؟ آپ کے اسٹاف میں دو درجن آدمی تو ہوں گے۔ سب کے سب شکل سے چور، اچکے اور نوسر باز لگتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی میرے دستخط بنا کر دکھا دے تو فوراً ایک ہزار انعام دوں گا۔ پھر گولی سے اڑا دوں گا۔ مسٹر میکلین نے کہا کہ میں بینک کے قوانین نہیں بدل سکتا۔ گرنڈلیز بینک میں بھی یہی قاعدہ ہے۔ ہم نے سارے فارم اسی سے نقل کیے ہیں۔ نقل کیا، مکھی پہ مکھی ماری ہے۔ بلکہ اس فارم پر تو پرنٹر کی لاپروائی سے نام بھی گرنڈلیز بینک ہی کا چھپا ہے۔ خان! تم ورنا کیولر کے بجائے انگریزی میں دستخط کرنے سیکھ لو تو اس جھمیلے سے خود بخود نجات مل جائے گی۔ اپنے حکم میں التجا کا رنگ پیدا کرنے کی غرض سے اس نے خان صاحب کی چائے اور پیسٹری سے تواضع کی۔ بامتثال امر، خان صاحب دو مہینے تک انگریزی دستخطوں کی مشق کرتے رہے۔ جب بالکل رواں اور پختہ ہوگئے تو چق اٹھا کر سیدھے مسٹر میکلین کے کمرے میں داخل ہوئے اور روبرو دستخط کر کے دکھائے۔ وہ اس طرح کہ پہلے ہاتھ اونچا کر کے چار پانچ دفعہ ہوا میں دستخط کیے اور پھر یکلخت قلم کاغذ پر رکھ کر فراٹے سے دستخط کر دیے۔ اس نے ترنت ایک سلپ پر اکاونٹنٹ کو حکم دیا کہ ان کی انڈمنٹی منسوخ تصور کی جائے۔ میں ان کے انگریزی دستخط کی جو انہوں نے میری موجودگی میں اس کارڈ پر کیے ہیں تصدیق کرتا ہوں۔

ہوا صرف اتنا تھا کہ خان صاحب نے ان دو مہینوں میں اپنے اردو دستخط کو دائیں سے بائیں کرنے کے بجائے بائیں سے دائیں کرنے کی مشق و مہارت بہم پہنچائی جس کے دوران نقطے اور مرکز غائب ہوگئے۔ مسٹر میکلین کے سامنے انہوں نے یہی دستخط بائیں سے دائیں کیے اور تمام عمر اسی انگلش روش پر قائم رہے۔ چیک اور کاروباری کاغذات پر اسی طرح دستخط کرتے۔ لیکن اگر کسی دوست یا رشتہ دار کو خط لکھواتے یا کوئی حلف نامہ داخل کرتے جس میں سچ بولنا ضروری ہو تو آخر میں اردو میں دستخط کرتے۔ مطلب یہ کہ قلم دائیں سے بائیں چلتا۔ خان صاحب کو دستخط کرنے کے فن پر اب اتنی قدرت حاصل ہوئی تھی کہ اگر جاپانی میں دستخط کرنے کے لیے کہا جاتا تو وہ اسی لیٹے ہوئے کاکروچ کو مونچھیں پکڑ کے سر کے بل کھڑا کر دیتے۔

خان صاحب کو کبھی بعجلت اتمام حجت کرنا مقصود ہوتا، یا مخالف و مخاطب کو محض بوجھوں مارنا ہوتا تو فرماتے کہ شیخ سعدی نے فرمایا ہے کہ ..... وہ اپنے تمام زریں و غیر زریں اقوال سے شیخ سعدی کے حق میں دست بردار ہوگئے تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ شیخ سعدی اگر ان اقوال کو سن لیتے تو وہ خود بھی دست بردار ہو جاتے۔

بات کتنی ہی غیر متعلق اور چھوٹی سی ہو، خان صاحب اس کی پچ میں بڑے سے بڑا نقصان اٹھانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ درگزر اور سمجھوتے کو انہوں نے ہمیشہ شیوہ مردانگی کے خلاف جانا۔ اکثر فرماتے کہ جو شخص خون خرابہ ہونے سے پہلے ہی سمجھوتا کر لے اس کے لیے پشتو میں بہت برا لفظ ہے۔ اس خرخشے کے بعد بشارت کو ایک مرتبہ بنوں میں ان کے آبائی مکان میں ٹھیرنے کا اتفاق ہوا۔ دیکھا کہ خان صاحب کسی گھمسان کے بحث مباحثے میں جیت جاتے یا کسی خوشگوار واقعہ پر بہت خوش ہوتے تو فوراً باہر جا کر گھوڑے پر چڑھ جاتے اور اپنے کسی دشمن کے گھر کا چکر لگا کر واپس آجاتے۔ پھر ملازم سے اپنے سر پر ایک آفتابہ ٹھنڈے پانی کا ڈلواتے کہ غرور اللہ کو پسند نہیں۔ ☆ (آب گم سے)

مشتاق احمد یوسفی

سرخیل قبیلہ یگانہ

(افتخار عارف اور ان کی شاعری)

BCCI نے جن ادیبوں اور شاعروں کو خراب و خوار و خجل اور خوش حال کیا، ان میں افتخار عارف کا تیسرا نمبر ہے۔ دوسرے نمبر پر محبی و مشفقی جناب الطاف گوہر ہیں جو دوران قیام لندن، اپنے آقائے سابق الانعام فیلڈ مارشل ایوب خاں کے کارناموں کو بزبان انگریزی رقم کر چکے ہیں۔ وہ اردو کے مانے ہوئے ادیب ہونے کے علاوہ عاقل و دور اندیش بھی ہیں۔ گمان غالب ہے کہ کتاب اردو میں اس لئے نہیں لکھی کہ اندیشہ تھا کہ پڑھنے والے سمجھ جائیں گے ...... اور پھر سمجھ لیں گے۔ ایسے نازک موضوعات پر ہاتھ قلم کروائے بغیر نثر میں کچھ کہنا مصنف کی چالاکی کے علاوہ جلاد کی نالائقی اور فرائض سے غفلت کا دستاویزی ثبوت ہے۔ اگر خدا نخواستہ ہاتھ قلم ہو جاتے تو پھر ہم جیسے عقیدت مندان قدیم اور افتخار عارف جیسے بیعت کنندگان جدید مرشد کے ہاتھ کی بجائے پیر کو بطور متبادل بوسہ گاہ چومتے۔ مگر وہ غلام اسحاق خاں کے خلاف "مسلم" میں دستخطی اداریئے کیسے لکھتے۔ وہ ہمارے لائق ترین اور واحد بیوروکریٹ ہیں جس کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے دو presidents کو جو اس کے باس رہ چکے تھے، ٹھکانے لگایا۔ ایک کو مخالفت کر کے اور دوسرے کو حمایت کر کے۔ جو خنجر و شمشیر سے نہ مرا، اسے kiss of death (بوسہ مرگ) سے سلادیا۔

اب اس خجل و خوش حال گھرانے کا پہلا نام کیا بتائیں اور کیسے بتائیں۔ زبان پہ آتے آتے رہ جاتا ہے۔ کسر نفسی "ہیں! ہیں!!" کرتی ہوئی منہ پہ ہاتھ رکھ دیتی ہے۔ اس کے علاوہ شہرت عام اور رشک خواص و عوام کا اندیشہ بھی ہے۔ یوں بھی تعلی شاعرانہ کا رواج اب صرف سیاسی تقریروں تک محدود ہے۔ جسے داغ کہتے ہیں دوستو، اسی روسیاہ کا نام ہے۔

اگر آپ اس وقت لحاظ کر کے خاموش بھی رہے تو باہر نکلتے ہی، مجھ سے نہیں تو افتخار عارف سے ضرور پوچھیں گے کہ ان باتوں کا "حرف باریاب" سے کیا تعلق؟ اس تعلق خاص کی وضاحت ذرا آگے چل کر کروں گا۔ پہلے خوشحالی کی اس شاخ ثمردار کی ایک جھلک دکھانے کو جی چاہتا ہے، جس کی باجاحت خوشہ چینی کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ BCCI کے دو سینئر افسروں کا انتقال ہوا تو بینک کے سیاہ و سفید و سرمیّ کے مالک جناب آغا حسن عابدی نے ان کی بیواؤں کے نام ایک ایک ملین ڈالر کے مکانات منتقل کرنے کا اہتمام کیا۔ اس کے علاوہ ایک ایک ملین ڈالر نقد ادا کئے گئے۔ یعنی ہر دو مدات ملا کر، دونوں کو چھ چھ کروڑ روپے اور ایک ایک مرسڈیز کار ملی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ سہاگنیں ان بیواؤں کو رشک کی نگاہ سے اور اپنے زندہ شوہروں کو قہر بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔

اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں ہم دونوں یعنی افتخار عارف اور فقیر شرمندہ شرمندہ سے پھرتے تھے کہ مرنا اگر یہی ہے تو جینا فضول ہے۔ BCCI کے در و دیوار زبان حال سے جان پر کھیلنے کی دعوت دیتے رہے:

اے مرد ناتواں تجھے کیا انتظار ہے؟

صاحبو! بروقت اور منفعت بخش موت ہر کس و ناکس کے مقدر میں نہیں ہوتی۔ یہ تمہید ہم نے بربنائے تفنن نہیں باندھی۔ BCCI نے بیرون ملک جو وسیلہ روزی و رسوائی فراہم کیا، اس کی سہولتوں اور فراغت فراواں کے طفیل ہمیں تین کتابوں کی سوغات ملی۔ افتخار عارف کی "مہر دونیم" "الطاف گوہر کی" "ایوب خاں"۔

اور تیسری کتاب ایک بار پھر افتخار عارف کی "حرف باریاب" جس کا معتدبہ حصہ لندن کے روز و شب کے جلی و خفی حوالوں سے بھرا ہوا ہے۔ میں اس مجموعے کے ایک ایسے دلچسپ پہلو کی طرف آپ کی توجہ کرانی چاہوں گا جس کی طرف غالباً ابھی تک کسی کی توجہ نہیں گئی۔ ظاہر بات ہے، ان کی شاعری ان کی واردات قلبی ہے اور کیوں نہ ہو۔ لیکن کم لوگوں کو علم ہوگا کہ ان کے بظاہر عشقیہ اشعار سے بھی BCCI کی تاریخ ولادت و فضیحت و وفات کے مادے نکلتے ہیں۔ ان کی اور عاجز کی آپ بیتی میں اس کی "پاپ" بیتی کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ افتخار عارف تیرہ سال BCCI سے متعلق و منسوب اور وظیفہ یاب رہے۔ اس کی داستان لذیذ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ اس میں کچھ بالانشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔ مگر ہم اس کو کسی نامناسب موقع کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ ہم ایک جملے کے کوزے میں اس بحیرہ تلخاب کو یوں بند کریں گے کہ بینک کو چلانے والوں نے پبلک ڈپازٹ کو منافع سمجھا اور منافع کو اپنا ماہانہ معاوضہ سمجھ کر کھا گئے۔

افتخار عارف کو ایک لحاظ سے BCCI اور اس کے آقایان ولی نعمت اور غزنویان عالی مرتبت کا فردوسی کہا جاسکتا ہے۔ شعر اگر ہمارا وسیلہ اظہار جلال و ملال ہوتا تو ہم بھی اپنے لئے یہی لقب تجویز کرتے۔ فرق اتنا ہے کہ روایت کے مطابق فردوسی نے انتقاماً محمود غزنوی کی ہجو اس وقت کہی جب اسے حسب وعدہ "شاہنامہ" لکھنے کے صلے میں اشرفیاں نہیں ملیں۔ لیکن افتخار عارف اور ہم فردوسی سے زیادہ چالاک نکلے کہ ہم نے شاہ اور اس کے مصاحبوں، حواریوں اور درباری مداریوں کی مدح لکھے بغیر پوری اشرفیاں ماہ بماہ وصول کیں اور ہجو بھی کہی۔ اشرفیاں ہمارا حق محنت تھا۔۔۔۔ وہ محنت جو تازہ بتازہ ہجو کہنے میں ماہ بماہ اور سال بسال کرنی پڑتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب محمود غزنوی کے گماشتے فردوسی کے گھر اشرفیوں کے توڑے لے کر پہنچے تو اس کا جنازہ نکل رہا تھا۔ لیکن موجودہ کیس میں جنازہ خود ممدوح کا نکلا۔ اس ضمن میں منتخب اشعار ہم آگے چل کر سنائیں گے۔

افتخار عارف اور ان کی شاعری پر میں تیسری بار مضمون پڑھ رہا ہوں۔ بظاہر اب صرف ایک کی اور گنجائش رہ گئی ہے۔ پرانے دوستوں کے بارے میں ہربار اور یکجنل اور بچی بات کہنا صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ ان سے دشمنی ہو جائے۔ میں نے ۱۹۸۳ میں اردو مرکز لندن اور پھر ۱۹۹۲ء میں کراچی جم خانہ میں افتخار عارف کے بارے میں جو کچھ پڑھا، اسے ان کے دوستوں نے مدحیہ اور دشمنوں نے مزاحیہ سمجھا اور دونوں خوش خوش گھر لوٹے۔ خود افتخار عارف یہ دیکھ کر محظوظ ہوئے کہ بچھو اپنے پیاروں کو پیار بھی اپنے ڈنک ہی سے کرتا ہے۔

اس دفعہ بھی وقت کی کمی اور اپنے تساہل غیر عارفانہ کے سبب، میں جہاں تہاں سے انہی مضامین سے اقتباسات، نئی ترامیم اور تازہ اضافوں کے ساتھ، پیش کروں گا جنہیں آپ اس طرح سماعت فرمایئے جس طرح پرانی گھسی پٹی فلم کے شائقین اس کا نام نہاد نیا پرنٹ دیکھتے ہیں جس میں یہ تک نظر نہیں آتا کہ اسکرین پر جو دو سائے نظر آرہے ہیں ان میں سے ہیروئن کون ہے اور ہیرو کون۔۔۔۔ تخیل کی آنکھ پہ حسرت کی عینک لگا کر ان کو یعنی اپنے ہی ماضی کو دیکھتے ہیں۔ جیسے دو سائے تمنا کے سرابوں میں ملیں۔

سرقے کی بدترین اور سب سے پھوہڑ شکل اپنے ہی فقروں کی تکرار اور اپنی ہی تحریر کی چوری ہے، جو صرف اس صورت میں جائز ہے کہ مصنف کو اللہ کی رحمت اور حاضرین کے حافظے کی کمزوری پر یقین کامل ہو۔ سو اسی اعتراف اور امید کے ساتھ گزارشات نو

میں پرانی تحریر کے پیوند جا بجا لگے ہیں۔ یہ نہ مقالہ ہے نہ خطبہ عالمانہ، بلکہ سادہ پانی کا وہ گلاس ہے جو ریستوراں میں اچھی چائے سے پیشتر مفت ملتا ہے۔ آپ دو ایک چند گھونٹ لے لیں تو میں خود اسے اٹھا کر علیحدہ رکھ دوں گا۔ پھر بادہ عارفانہ کا دور چلے گا۔

جب کسی شخص کی دشمنوں کی تعداد میں یکایک اور بلاوجہ زبردست اضافہ ہو جائے تو جاننا چاہیے کہ اس نے زندگی میں قابل ذکر اور قریبی دوستوں کے لئے ناقابل برداشت ترقی کی ہے۔ یعنی اس کی اپنی تمنا سے کم، مگر حاسدوں کی تاب سے زیادہ۔ جب یہ منزل آجائے تو ترقی کی رفتار کو مخالفین کے رشک و حسد کے درجہ شدت سے ناپا جا سکتا ہے۔ سو افتخار عارف اس دوست آزما مرحلے سے زخمی مگر سربلند گزرے ہیں۔ انداز ان کا فاتحانہ کم، فدویانہ زیادہ ہے۔ یہ ان کی شائستگی کا تقاضا، منصب کی مجبوری اور طبیعت کا ڈسپلن ہے۔ وہ مشاعروں میں جم کے پڑھتے ہیں اور کسی کو جمنے نہیں دیتے۔ اتنی کم مدت میں اتنی شہرت کمانے کے بعد کوئی شاعر اپنے ہم چشموں کا ہیرو نہیں بن سکتا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ انہیں شہرت تو بہت ملی مگر اس کے نتیجے میں ملا کیا؟

اک خلعت دشنام و کلاہ سخن بد

قصور ان کا صرف اتنا ہے کہ اچھا شعر کہتے ہیں اور اس طرح پڑھتے ہیں کہ سمجھ میں نہ آئے تو دگنا مزہ دیتا ہے۔ محترمی ظفر صاحب نے کہ آشنائے رموز شعر و شہرت و دشنام ہیں، ایک منہ بولتی ردیف میں کیا حسب حال شعر نکالا ہے:

گمنام جو بھی رہتا ہے، عزت اس کی ہے
مشہور ہوئے گا، تو بہت خوار ہوئے گا

شعر لاجواب ہے، مگر ظفر اقبال کو گمنامی کا ذاتی تجربہ نہیں۔ ہم کہ یکے از انبوہ گمنامان پاکستان ہیں، اپنے تجربے کی بنا پر عرض کریں گے کہ بے عزتی تو گمنامی میں بھی ہوتی ہے، مگر اس طرح جیسے ایک روزہ دار دوسرے روزہ دار کو گالی دے۔

انہیں جو مقام، شہرت اور ستائش بال سفید ہونے سے پہلے ملی، وہ اردو شاعروں کو بالعموم مرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔

یادش بخیر! تحسین سروری ایک معروف ادیب گزرے ہیں۔ آخری ایام میں مفلسی نے گھر میں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ کچھ اس کا سبب حالات تھے اور کچھ، بلکہ بہت کچھ، وہ خود۔۔۔ احباب نے مشورہ دیا کہ رائٹرز گلڈ سے رجوع کرو۔ تحسین سروری نے اپنی درخواست میں لکھا کہ رائٹرز گلڈ میری وفات کے بعد، حسب ضابطہ و دستور، میری بیوہ کو ایک ہزار روپے ماہوار وظیفہ دے گی۔ میری استدعا ہے کہ مجھے اس کا نصف یعنی پانچ سو روپے زندگی میں ہی دے دیئے جائیں تاکہ میں مرنے سے اور گلڈ دگنی زیرباری سے بچ جائے۔

افتخار عارف کو بھی حکومت برطانیہ نے قبل از پیری، پنشن کا حقدار تسلیم کر لیا ہے۔

وہ بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی ہیں۔ جو لوگ کسی لحاظ سے واجب الاحترام نظر نہیں آتے، انہیں بھی ــــ بلکہ ادبدا کے انہیں کو تعظیم دیتے ہیں جس شخص سے افتخار عارف غیر معمولی تواضع و تکریم سے پیش آئیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے مافوق الفطرت حد تک نالائق سمجھتے ہیں۔ پہلے پیر چھوا کرتے تھے، اب گھٹنے کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ خدا وہ دن جلد لائے جب ان کی گردن پکڑ سکیں۔ کہتے ہیں:

مٹی، پانی، آگ، ہوا، سب اس کے رفیق
جس کو اصول فرق مراتب آتا ہے

چار عناصر تو ان کے رقیب ہوگئے، مگر ان سب کا مجموعہ شوریدگی۔۔۔۔ انسان۔۔۔ نہ کبھی کسی کا ہوا، نہ ہوگا۔ ہر ایک سے تپاک اور گرم جوشی سے ملنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن کے دلوں میں خود کھوٹ ہے ان کو یار کے پیار میں بھی P.R نظر آتا ہے۔ خود کو دنیوی اعتبار سے چوکس اور ہوش مند ثابت کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دوسروں کی مہر و مروت کو منافقت سے تعبیر کیا جائے۔

کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے
ہمیں تو لگے ہے وہ عیار سا

افتخار عارف کے ذوق اور مزاج کا تھوڑا بہت اندازہ ان کی پسند و ناپسند کی قطعیت اور تنوع سے ہوتا ہے۔ آئیے، پہلے ان کی چڑ پر نظر ڈالیں۔ ٹھس آدمی، شعر ناشناس باس، بینکرز، ہر قسم کی دال اور سبزی، صحیح سائز کی قمیض، بدن کی ہر وہ جنبش اور حرکت جس پر ورزش کا گمان ہو، چھوٹی بحر اور پختہ عمر والوں کی صحبت سے پرہیز کرتے ہیں۔

اب ذرا ان کی مرغوبات ملاحظہ ہوں: پہلے نمبر پر سیخ کباب، دوسرے نمبر پر شامی کباب، تیسرے نمبر پر بہاری کباب، پھر کسی بھی قسم کا کباب جو دستیاب ہو۔ اس کے بعد بریانی جس میں چاول برائے نام ہوں، تیز مرچیں اور گرم مصالحہ اور اسی خاصیت کے تازہ ترین اسکینڈل۔ ہر قسم کا میٹھا جس میں شکر کے ساتھ کسی اور چیز کی ملاوٹ نہ ہو۔

نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب شکر خوری

مرزا کہتے ہیں کہ یورو پین "میٹھے" ذیابیطس کے مریضوں نے ایجاد کئے تھے۔ سیاہ رنگ بھی پسند ہے بشرطیکہ غلط جگہ نہ لگا ہوا ہو۔ مطلب یہ کہ چہرے پر نہ ہو۔ کتاب سے عشق ہے۔ چنانچہ وہ چہرے بھی پسند ہیں جو اس سے مشابہت رکھتے ہوں۔ یعنی کتابی ہوں:

کہ دیکھیں جن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

ان کے برعکس مرزا کو کتابی چہرے سے چڑ ہے، مگر اشگوپیل خاتون کو قدر و شیفتگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، بشرطیکہ وہ کسی اور کے نکاح میں ہو۔ تین "خ" کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ Triple "خ" مختلف سے مراد ہیں: خوبصورت خواتین کے خاوند۔ واضح رہے کہ یہ بات ہم نے مرزا کے بارے میں کہی ہے اور صرف یہ دکھانے کے لئے کہ چڑ کی کوئی معقول وجہ نہیں ہوا کرتی۔ افتخار عارف کو رات گئے تک گپ، بند گلے کا سفید کوٹ، سرخ موزے، جوانی کے مجروح جذبات سے میچ کرتی ہوئی ٹائی، یعنی لہو لہان لال۔ زردی مائل سلک کی قمیض انہیں بھاتی ہے، اور سچ تو یہ ہے خوب پھبتی ہے۔

زرد رنگ پر یاد آیا کہ ایک دن ہمارے دوست پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے اپنی جمالیاتی ترجیحات کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ انہیں بسنتی رنگ، گدرایا ہوا سڈول پن، چکنی جلد اور گداز contours بہت پسند ہیں۔ اس پر مرزا عبدالودود بیگ بولے کہ یہ پانچوں خوبیاں "بدرجہ اتم" کراچی کے پپیتے میں پائی جاتی ہیں۔

کیسی شاعری اچھی ہوتی ہے اور کون سی بری، اس کی وضاحت، مولانا حالی کی طرح، بعض شاعر اپنے مقدمے میں کر دیتے ہیں اور بعض اپنے ہی اشعار سے یہ فرق ذہن نشین کروا دیتے ہیں۔ افتخار عارف نے نہ کمزور اور ڈھیلا شعر کہا، نہ ہماری طرح اپنا مقدمہ آپ لکھ کر دوسرے تعریف کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ ان کے پہلے شعری مجموعے "مہر دو نیم" کی ابتداء دو معرکتہ الآرا مقدموں سے ہوتی ہے۔ پہلے مقدمے میں فیض نے ان کی انفرادیت، آہنگ و عروض، لغت اور محاورے میں اجتہاد، ظلم و تعدی، جبر و زباں بندی کے خلاف احتجاج اور رزق کے اسیروں کی محتاجی اور تذلیل پر بڑے جامع اختصار کے ساتھ تبصرہ کیا ہے اس مختصر مگر خوبصورت مقدمے کے ہوتے ہوئے، مخدومی محبی پروفیسر گوپی چند نارنگ کے عالمانہ اور بھاری بھر کم مضمون کی، بحیثیت مقدمہ ثانی، چنداں ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ بعض ادبی حلقوں میں اس پر چہ میگوئیاں بھی ہوئیں۔ جس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان حلقوں کو دونوں ممتاز بزرگوں کی متفقہ تعریف نے بے مزہ کیا۔ لیکن معترضین یہ بھول جاتے ہیں کہ افتخار عارف اپنی وضع احتیاط اور رکھ رکھاؤ کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ لکھنؤ میں یہ دستور تھا کہ بہو بیٹیاں، بالخصوص نئی نویلی دلہن، ڈولی میں بیٹھ کر کہیں جاتیں تو رستے میں کہاروں کو کندھا نہیں بدلنے

دیتی تھیں اور روانہ ہونے سے پہلے ڈولی میں ایک پتھر رکھوا دیتی تھیں تا کہ کہاروں کو اصل وزن کا اندازہ نہ ہو سکے ۔ بعض کمزور دل والے فقط وزن پر ہی عاشق ہو جایا کرتے تھے ۔ سو محب گرامی قدر پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مقدمہ وہ بھاری پتھر ہے جو چوم چوم کر چھوڑنے کی بجائے ساتھ رکھنے کے لائق ہے کہ ہما شما کی نظر بد سے بچاتا ہے ۔

یہ ڈولی میں پتھر والی بات جب لندن سے سینہ اور حسینہ بہ حسینہ دلی پہنچی تو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بہت برا مانا ۔ حالانکہ خدا گواہ ہے ، ہمارا مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ ایسی شاعری کسی سر ٹیفکیٹ کی محتاج نہیں ۔ عزیزم افتخار نے منہ سے تو کچھ نہ کہا کہ وہ ہماری محبت ، خلوص نیت اور پھوہڑ پن پر یقین کامل رکھتے ہیں ، مگر اس واقعے کے بعد ہم نے دیکھا کہ ہم کوئی مضمون پڑھ رہے ہیں تو ایسی گونگی تالی بجانے لگے جس میں دونوں ہاتھ تو ملتے ہیں ، آواز بالکل نہیں نکلتی ۔ آج صبح ہم نے برادرم مشفق خواجہ سے اپنی الجھن اور دونوں عزیز دوستوں کی آزردگی کا ذکر مشورۃً کیا تو فرمایا کہ ان سے کہہ دیجئے کہ میں اب ڈولی سے یہ پتھر اس وقت تک نہیں نکال سکتا جب تک تم کسی دوسرے پردہ نشین کی ڈولی کا پتہ فراہم نہ کرو جس میں یہ پتھر رکھ سکوں ۔

لندن کی اس خوبصورت اور یادگار تقریب میں میں نے اعتراف کیا تھا کہ میں نے کبھی شعر نہیں کہا ، اور ازبسکہ میرے کام نثر سے اچھے خاصے نکل جاتے ہیں ، اس لئے آئندہ شعر کہنے کا کوئی احتمال بھی نہیں ۔ میں نقاد بھی نہیں کہ اچھے اور برے شعر میں تمیز کر سکوں ۔ نہ میری صحت اس کی اجازت دیتی کہ میں کسی بھی برے شاعر کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کر سکوں ۔ غالباً کیا ، یقیناً ، ان ہی خامیوں کی بنا پر آپ نے مجھے اظہار رائے کی دعوت دی ہے ۔ میں نے اس دن یہ بھی عرض کیا تھا کہ دراصل مجھ جیسے نثر نگار کا فیض صاحب کے سامنے شعری محاسن پر گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بکری کچھار میں جا کر شیر کو vegetarianism کے فوائد و فضائل پر لکچر دے ۔ میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں افتخار عارف ہی سے رجوع کرنا چاہئے کہ وہ اچھا شعر کہنے کے علاوہ شعر اور شاعر کے پارکھ بھی ہیں ۔ وہ خراب شعر ، نیم گرم دوستی ، صحیح سائز کی قمیض اور ٹھنڈا کباب برداشت نہیں کر سکتے ۔ خراب شعر ، نثری نظم اور بے رس نثر لکھنے والوں کے بارے میں ایک زمانے میں افتخار عارف کا عقیدہ تھا کہ ان کی نماز جنازہ حرام ہے ۔ یہ بھی پرانی تہذیب کی شائستگی ، اور موجودہ کلچر کی مجبوری ہے کہ بد کو جس نے خلق خدا کی زندگی عذاب کر دی ہے ، کبھی زندگی میں روکتے تھے ، نہ ٹوکتے تھے ۔ اس کے غسل میت اور تجہیز و تکفین کے بعد اس کا جنازہ سامنے رکھا جاتا اور لوگ ہر طرح سے اطمینان کر لیتے کہ اب یہ اٹھ کر ذلیل نہیں کر سکتا تو پہلی بار اس کے بارے میں سچ بولتے تھے ، اور نماز جنازہ حرام ہونے کا فتویٰ دیتے تھے ۔ پہلے ہم موت سے نہیں ڈرتے تھے ، مگر اب ہمیں محض افتخار عارف کے فتوے کی وجہ سے موت سے ڈر لگنے لگا ہے ۔ اس لئے کہ پشتو محاورے کے مطابق ہم اپنا مردہ خراب نہیں کروانا چاہتے ۔

اس زمانے میں خراب شاعر کے لئے افتخار عارف نے ایک اصطلاح وضع کر رکھی تھی "بکری شاعر" ۔ شعر و شاعری سے بیزاری کی وجہ تو ہماری سمجھ میں بھی آتی ہے لیکن بکری میں ہمیں پہلی نظر میں اس کے علاوہ کوئی خرابی نظر نہیں آتی کہ افتخار عارف اس کے کباب بڑے شوق سے کھاتے ہیں ۔ داد افتخار عارف خراب شعر کی بھی دیتے ہیں کہ یہ ان کی شائستگی اور آداب سماعت کا تقاضا ہے ۔ مگر لطیف فرق کے ساتھ کہ اچھے شعر پر سینہ پہ ہاتھ رکھ کر سبحان اللہ ، سبحان اللہ کہتے ہیں ۔ برا شعر سنتے وقت ان کے منہ سے کچھ عجیب و غریب آوازیں نکلتی ہیں جو داد سے مشابہ ضرور ہوتی ہیں ، مگر ڈکشنری میں نہیں ملتیں ۔ لگا تار خراب شعر سننے پڑیں تو وہ سر پیٹنے کی بجائے دائیں ہاتھ سے بار بار اپنا زانو پیٹتے ہیں ۔ اگر شعر بہت ہی خراب ہو تو اٹھ کر اپنے مخصوص انداز میں شاعر کے گھٹنے پکڑ لیتے ہیں جس کی بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ کہیں وہ شعر سنا کر بھاگ نہ جائے اور یہ اسے اپنی تازہ غزل بھی نہ سنا سکیں ۔

افتخار عارف ایک لطیفہ ایک ذہین اور منہ پھٹ شاعر کے حوالے سے سناتے ہیں ۔ اس نے ایک شاعر سے جو دس سال سے بڑی لگن اور مستقل مزاجی سے شعر کہہ رہے تھے ، پوچھا "کیا آپ کو کبھی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ میں بھی اچھے شعر کہہ سکتا!" ☆ (باقی آئندہ شمارہ میں)

مشتاق احمد یوسفی (فیض احمد فیض۔ ایک تاثر)

"اپنے آپ کو معاف کر دیا کیجیے"

فیض صاحب کے سیاسی مسلک سے لوگوں کو اختلاف رہا ہے اور میں بھی ان ہی میں سے ہوں، لیکن آزادی، احترام آدمیت اور انسانی اقدار کی پاس داری جس پامردی اور استقامت سے انھوں نے کی وہ لائق تحسین و تکریم ہے۔ جس مسلک کج کلاہی کی سمت انھوں نے ایک دفعہ اپنا قبلہ درست کر لیا پھر اسے تا عمر نہیں بدلا اور اپنے اسی عہد وفا میں علاج گردش لیل و نہار ڈھونڈا اور انھوں نے یہ اس زمانے میں کیا جب مصلحت کدہ میں ایسے لکھنے والوں کا سکہ چلتا تھا جو ہر کھیل کے بعد اپنا اینٹنا Antenna کا رخ بدلتے رہے تھے بلکہ بعضے تو دوسرے کے "اینٹنا" میں اپنا تار جوڑ کے "تماشائے اہل قلم دیکھتے ہیں۔" کتنے ایسے ہیں جو نصف صدی تک ایک ہی وضع پر قائم رہے ہوں؟ بدلتی رت کے ساتھیوں نے وفاداریاں بدلیں، مسلک بدلے، کچھ دکھیاروں پر تو ایسا بجوگ پڑا کہ انھوں نے مارے ڈر کے فقط مشرب ہی نہیں بدلا مشروب بھی بدل دیا یعنی سادہ پانی پی پی کے بہکنے اور لڑکھڑانے لگے۔ برگزیدگی کی تلاش میں نکلے تھے صرف گزیدگی ہاتھ لگی۔ ان کا ضمیر تو کیا صاف ہوگا ان بچاروں کا تو مافی الضمیر تک صاف نہیں۔

فیض صاحب سے میری پہلی ملاقات چھ سال پہلے مخدومی ماجد علی صاحب کے یہاں ہوئی بہت سے نیاز مند فیض صاحب کا حلقہ کیے بیٹھے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ کسی نے فیض صاحب سے میرا تعارف کرایا یا نہیں۔ بہر حال میں دو گھنٹے تک حسب معمول و موقع، خاموش بیٹھا مزے مزے کی باتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ دوسرے دن علی الصبح عزیز گرامی افتخار عارف کا فون آیا کہ فیض صاحب آپ کے یہاں آج کسی وقت آنا چاہتے ہیں۔ ہوا یہ کہ آپ کے جانے کے بعد انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ وہ صاحب جو اپنی بیگم کے پہلو میں سر نہوڑائے، گم صم بیٹھے تھے وہ کون تھے؟ میں نے انھیں بتایا کہ وہ یوسفی صاحب تھے اور یہ ان کا نارمل پوز اور پڑوس ہے۔ فیض صاحب کہنے لگے "تم نے تعارف کیوں نہیں کر دیا؟" میں نے کہا میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ یوسفی صاحب سے کبھی نہیں ملے کہنے لگے "ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ مجھے بڑی ندامت ہے۔ صبح ہی مجھے لے چلو۔"

میں نے افتخار عارف سے کہا۔ "فیض صاحب سے عرض کر دیجیے کہ آج شام عطار خود حاضر خدمت ہو کر اپنے مشک کا تعارف کروا دے گا۔ جائے واردات وہی مرجع خلائق ماجد علی صاحب کا دولت کدہ۔ شام کو ملاقات ہوئی تو فیض صاحب اتنے محجوب تھے کہ مجھے خود اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ خود کو اس کوتاہی پر بھی قصور وار ٹھیرا رہے ہیں کہ میری اور ان کی ملاقات پندرہ بیس سال پہلے کیوں نہ ہوئی! فیض صاحب کے اس انکسار اور حسن اخلاق سے میں اس لیے اور بھی متاثر ہوا کہ مجھے نہ جانے کیوں اب بھی یقین ہے کہ اس وقت تک انھوں نے میری کوئی تحریر نہیں پڑھی تھی۔ سنی سنائی تعریف پر ایمان لے آئے تھے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ وہ کم سخن تھے اور میں حسب معمول اپنے خول میں بند اور جب دونوں بزرگ فریق شرمیلے واقع ہوں تو برخوردار

افتخار کا طوطی اگر بولے، نہیں تو کیا کرے۔

بعض باتیں ایسی ہیں جو فیض صاحب کے مزاج اور مسلک کے خلاف تھیں، مثلاً انھیں کبھی روپے کا ذکر کرتے نہیں سنا، اپنی کسی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سنا۔ زمانے کی شکایت یا اپنے سیاسی مسلک کے بارے میں نثر میں کبھی گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا۔ کسی کی غیبت اور برائی نہیں سن سکتے تھے۔ کوئی ان کے سامنے ادبدا کر کسی کا ذکر بہ بدی کرتا تو وہ اپنا ذہن، زبان اور کان سب سوئچ آف کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ مجھ سے پوچھا "آج کل کچھ لکھ رہے ہیں یا بینک کے کام سے فرصت نہیں ملتی۔" میں نے کہا "فرصت اور فراغت تو بہت ہے مگر کاہل ہوگیا ہوں۔ پتا نہیں مارا جاتا۔ مطالعے کی عیاشیوں میں پڑگیا ہوں اور جب کسی لکھنے والے کو پڑھنے میں زیادہ مزا آنے لگے تو سمجھیے حرام خوری پر اتر آیا ہے۔" میں بہت دیر تک خود کو اسی طرح برا بھلا کہتا رہا۔ فیض صاحب خاموش سنتے رہے۔ پھر شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اتنے نزدیک آگئے کہ ان کی سگریٹ کی راکھ میری ٹائی پر گرنے لگی۔ کہنے لگے۔ "بھئی ہم کسی کی غیبت نہیں سن سکتے۔ کسی سے کینہ رکھنا اچھا نہیں۔ اپنے آپ کو معاف کر دیا کیجیے۔ درگزر ثواب کا کام ہے۔"

("مطالعہ، فیض۔ یورپ میں" مؤلف: اشفاق حسین)

●☆●

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی اگرچہ آزادی سے قبل مشق کے طور پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے لیکن وہ سب رسائل میں مدفون ہے اور انھوں نے اس کا انتخاب تک چھپوانا مناسب نہیں سمجھا چنانچہ آزادی کے بعد انھوں نے جو مزاحیہ مضامین لکھے انھی کو نمائندہ اور بہترین تخلیقات سمجھتے ہوئے "چراغ تلے" ۱۹۶۱ء اور "خاکم بدہن" ۱۹۷۰ء میں شامل کیا ہے۔ "زرگزشت" ۱۹۷۶ء ان کی سوانح عمری ہے لیکن اس میں انھوں نے خود کو مرکزی کردار نہیں سمجھا بلکہ اپنے اردگرد کے لوگوں اور واقعات ہی پر پرلطف تبصرے کو زیادہ تر اہمیت دی ہے۔ نہ ہی اس میں انھوں نے اپنی زندگی کے واقعات ترتیب سے اور ازابتداء تا انتہاء بیان کیے ہیں۔ بقول ان کے یہ ان کی "سوانح نوعمری" ہے۔ "آب گم" ۱۹۹۰ء میں بقول ان کے "کہانی نما خاکے" شامل ہیں۔ یہ دراصل ان کے دوستوں کے واقعات و حالات زندگی ہیں۔ جنھیں رنگ آمیزی سے بیان کیا گیا ہے اور یہ ساخت کے لحاظ سے موتاژ سے قریب ہیں۔

ابتداء میں یوسفی، شفیق الرحمن سے بے حد متاثر تھے۔ حتیٰ کہ جب شفیق الرحمن کے انداز میں نہ لکھ سکے تو لکھنے کا ارادہ ترک کردیا۔ لیکن بعدازاں خود اپنے ہی انداز میں لکھنے کا ارادہ کیا۔ ان کے مضامین پاکستان کے ادبی رسائل میں چھپے۔ اور "چراغ تلے" کی صورت میں منظر عام پر آئے تو ان کے منفرد انداز نے تہلکہ مچادیا۔

یوسفی کے اسلوب کے بارے میں دو باتیں خاص طور پر کہی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کا طرز نگارش رشید احمد صدیقی سے بڑی حد تک مماثلت رکھتا ہے خاص طور پر ان کا لفظی الٹ پھیر اور الفاظ کی تقدیم و تاخیر اور ان کی تکرار alliteration سے مزاح پیدا کرنا۔ دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ پطرس اور رشید احمد صدیقی کے ملے جلے اسلوب سے یوسفی کا اسلوب وجود میں آیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ یوسفی کا انداز پطرس کی طرح شگفتگی اور بذلہ سنجی سے بھرپور ہے اور رشید احمد صدیقی کی طرح اس میں لفظی الٹ پھیر اور تکرار بھی موجود ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے باوجود یوسفی کا ایک مخصوص اور منفرد اسلوب ہے جو رشید احمد صدیقی اور پطرس سے قطعی الگ اور ممتاز ہے۔ کیونکہ بذلہ سنجی اور لفظی الٹ پھیر کے علاوہ یوسفی کے اسلوب کی اور بھی خصوصیات ہیں، مثلاً برجستگی و بے ساختگی، قول محال، خیال معکوس یا تقلیب الفاظ، لفظی تحریف و تصرف، دانش زیست، تفکر و تفلسف، اور مخصوص زبان جس میں عربی اور فارسی کے ادق الفاظ کے ساتھ ساتھ ہندی کے بلکہ سنسکرت الاصل الفاظ بھی موجود ہیں۔ ساتھ ہی پاکستان کی علاقائی زبانوں مثلاً پنجابی، سندھی اور بلوچی کے الفاظ انھوں نے "زرگزشت" اور "آب گم" میں برمحل استعمال کیے ہیں۔

دو تین خواص ایسے ہیں جو یوسفی ہی سے وابستہ ہیں اور اردو کے کسی اور مزاح نگار نے ان کو نہیں برتا۔ ایک تو الفاظ، تراکیب اور مصرعوں کی بکثرت تحریف۔ وہ اتنی کثرت سے الفاظ و تراکیب کی تحریف یا ان میں حسب منشا تصرف کرتے ہیں کہ اصولاً ان کی تین ابتدائی کتابوں میں بے شمار مقامات پر وادین (inverted commas) کا استعمال ہونا چاہیے۔ لیکن یوسفی ایسے چپ چاپ گزر جاتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ البتہ چوتھی کتاب یعنی "آب گم" میں انھوں نے بعض جگہوں پر وادین کا اہتمام کیا ہے اور

بعض مقامات پر حسب سابق خاموشی سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ دوسری خصوصیت خیال معکوس ہے۔ وہ بعض عام باتوں اور خیالات کو اس طرح الٹ دیتے ہیں کہ بادی النظر میں احساس ہی نہیں ہوتا۔ اس کے لیے وہ عموماً الفاظ کی تقدیم و تاخیر، ترتیب میں تقلیب، تکرار اور الٹ پھیر سے کام لیتے ہیں۔ یہ دونوں خصوصیات اتنے تسلسل اور کثرت سے ملتی ہیں کہ ان کی تحریر میں ایک عجیب "اچانک پن" اور "غیر متوقع پن" پیدا ہو گیا ہے جو قاری کو ہر قدم پر تحیر اور شرارت سے دوچار کرتا ہے اور یہ تحیر فوراً ہی قہقہے یا مسکراہٹ میں تبدیل ہو کر قاری کے لئے ایک انبساط اور ذہنی انشراح پیدا کرتا ہے جو بعض ایسے معمے اور پہیلیاں بوجھتے ہوئے پیدا ہوتا ہے جن کی بنیاد پن pun پر ہوتی ہے۔ (انگریزی میں ایسے puns بکثرت ملتے ہیں) اور اس طرح ان خصوصیات کے اجتماع سے تیسری خصوصیت یعنی قہقہہ انگیز تحیر جنم لیتا ہے۔

پھر یوسفی کی مخصوص زبان، ان کی تفلسف و تفکر (جو دانش زیست اور بذلہ سنجی کی وجہ سے "قول" بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے)، ہنسی ہنسی میں پتے کی بات کہہ جانا اور ادبی تلمیحات، ان کے اسلوب کو ایک ممتاز منفرد اور پورے اردو مزاح کی تاریخ میں ایک قطعی جداگانہ رنگ دیتے ہیں۔ یوسفی کا مزاح گفتگو اور تبصرے کا مزاح ہے۔ اس میں طنز بھی شگفتگی کی شیرینی میں لپٹا ہوا ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ کی صورت میں، جو بقول ان کے ان کا ہمزاد ہے، وہ بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور ذہانت کا ایک شاندار نمونہ پیش کرتے ہیں۔ یہ تمام خصوصیات مل کر ان کو اردو نثر میں ایسا مقام دیتی ہیں جو بہت کم مزاح نگاروں کے حصے میں آیا ہے۔ اگر اردو کے نثری مزاح کی تاریخ اور تسلسل کو دیکھتے ہوئے ہر دور کے بہترین مزاح نگاروں کا چناؤ کیا جائے تو دور حاضر کے بہترین مزاح نگاروں میں یوسفی کا نام لازماً شامل ہوگا۔

یوسفی کے مزاح کا پس منظر

یوسفی کے ہاں موضوعات کا تنوع ملتا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ نہ صرف سیاسی موضوعات سے پرہیز کرتے ہیں بلکہ انھوں نے بالعموم سماجی مسائل سے بھی دامن بچایا ہے۔ چونکہ ان کا مقصد بنیادی طور پر ہنسنا ہنسانا اور خوش باشی ہے لہٰذا ان کے ہاں سیاسی و سماجی مسائل کی گنجائش بھی نہیں نکلتی۔ لیکن یوسفی خالص مزاح نگار ہوتے ہوئے بھی خالص مزاح نگار نہیں ہیں اور ان کے ہاں طنز بھی مل جاتا ہے۔ ان کے طنز کے موضوعات اور نشانے روزمرہ کے واقعات، افراد اور ان کی عادات اور خود اپنی ذات یا ماحول کی چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں۔ مثلاً کرکٹ، چارپائی، عورتوں کا مٹاپا، بیماری اور بیمار کی عیادت، موت اور اس کے بارے میں لوگوں کا ردعمل، مرغیاں پالنا، پہاڑی مقامات کی سیر وغیرہ۔ یہ سماج اور تہذیب کا حصہ ضرور ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی گمبھیر سماجی مسئلہ یا اہم تہذیبی موضوع نہیں۔ سیاست تو بہت دور کی بات ہے۔ چنانچہ یوسفی کے سیاسی نظریات کا کھوج لگانا ممکن نہیں۔ "آب گم" میں ایک آدھ جگہ انھوں نے آمریت اور آمروں کے حامی اہل قلم پر طنز کیا ہے۔۱۰

چند ایک مقامات پر اکادکا تبصرے سیاسی پس منظر میں کیے گئے ہیں۔ مثلاً پاکستان کے لئے امریکی گندم کی صورت میں امداد کا ذکر یوں ملتا ہے۔

امریکہ سے پہلے پہل خیراتی گندم کی کھیپ آئی تو وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے کراچی کے اونٹوں کے گلے میں "تھینک یو امریکہ" کی تختیاں لٹکوا کر شہر میں گشت کروایا تھا۔ امریکہ کو یہ خیار گندم اور اونٹ کی زبانی قومی جذبہ تشکر کی ترجمانی بہت بھائی۔ چنانچہ اس نے بجا طور پر وزیر اعظم کے بجائے بشیر ساربان کو امریکہ کے دورے کی دعوت دی۔

یا ابوالکلام آزاد کی سیاست پر یوں سرسری تبصرہ ان کے ایک مضمون "بارے آلو کا کچھ بیاں ہو جائے" میں آتا ہے۔ "مولانا

مشروب بھی ان کے مشرب کی مانند تھا۔ ٹوٹے ہوئے بتوں کو جوڑ کر امام الہند نے ایسا معبود تراشنے کی کوشش کی جو اہل سومنات کو بھی قابل قبول ہو۔

لیکن یہ یوسفی کا اصل رنگ نہیں۔ مذہب کو بھی انھوں نے موضوع نہیں بنایا۔ اور مذہب بھی ان کے ہاں سیاست ہی کی طرح ایک مہمان کی طرح آتا ہے جس کا ذکر ضمنی طور پر کرتے ہیں، جیسے بیماری اور تیمارداری پر لکھے گئے مضمون "پڑیئے گر بیمار" میں لکھتے ہیں۔ "مجھے اس بات قطعاً تعجب نہیں ہوتا کہ ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگ خونی پیچش کا علاج گنڈے تعویزوں سے کرتے ہیں۔ غصہ اس بات پر آتا ہے کہ وہ واقعی اچھے ہوجاتے ہیں۔"

گویا ایک خالص مزاح نگار بھی نادانستگی میں اپنے ماحول اور حالات کا ذکر اور ان پر طنز کرجاتا ہے۔ یوسفی نے مذہب اور اس کے متعلقات پر گو زیادہ اظہار خیال نہیں کیا لیکن جہاں بھی کیا ہے اس میں کچھ زیادہ احترام اور خوش عقیدگی نہیں ملتی بلکہ ایک آدھ مقام پر توان کی بذلہ سنجی مذہب اور اس کے متعلقات کے سلسلے میں ذرا تکلیف دہ بھی ہوگئی ہے۔

یوسفی کے ہاں ایک موضوع ایسا ملتا ہے جس پر وہ دل کھول کر اور مزے لے لے کر لکھتے ہیں، وہ ہے جنس اور عورت۔ عورت اور جنس کا ذکر آتے ہی یوسفی صاحب کھل سے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی بہکنے بھی لگتے ہیں اور تلذذ سا محسوس کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہمارے کلچر کی عام باتوں مثلاً چارپائی، کرکٹ اور اردو کے مقامی لب و لہجے وغیرہ پر بھی ان کے ہاں بڑے شگفتہ اور پھڑکتے ہوئے تبصرے ملتے ہیں۔

کراچی کے بارے میں بھی انھوں نے خصوصی طور پر اظہار خیال کیا ہے۔ محمد خالد اختر نے تو کراچی کے ماحول، فضا، مقامات اور کرداروں کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ یوسفی کراچی کی آب و ہوا، اس کی رنگارنگی اور باشندوں کے بارے میں نہایت عمدہ تبصرے کرتے ہیں۔ ان کا مضمون "موسموں کا شہر" ایک انتہائی پرلطف اور ان کے مخصوص رنگ کا حامل مضمون ہے جو کراچی کے موسم کے بے تکے پن اور غیر یقینی ہونے کو بڑی عمدگی سے واضح کرتا ہے۔ جیسے۔ "ہم نے کراچی کے ایک قدیم باشندے سے پوچھا کہ یہاں مانسون کا موسم کب آتا ہے؟ اس بزرگ باراں دیدہ نے نیلے آسمان کو تکتے ہوئے جواب دیا کہ چار سال پہلے تو بدھ کو آیا تھا۔"

"زرگزشت" کے بھی اکثر کردار (اگر انھیں کردار کہا جاسکتا ہے تو) اور خود مصنف بھی کراچی پر بڑے دلچسپ تبصرے کرتے ہیں اور اس شہر کی خصوصیات کو واضح کرتے ہیں۔ "آب گم" میں بھی کراچی کو ایک خاص نظر سے دیکھا گیا ہے۔ جیسے "کراچی کی پانچ چیزوں کا کم از کم اس دنیا میں تو جواب نہیں۔ جڑاؤ زیورات، قوالی، بریانی، گالی اور عود کا عطر۔"

اسی طرح:

"تمباکو کے بارے میں پہلی بات تو یہ یاد رکھیے کہ کراچی کی آب و ہوا اسے موافق نہیں آسکتی۔ اسے ہی کیا کسی کو راس نہیں آتی۔ البتہ جیسا تندرست، قیمتی اور خالص گدھا یہاں دکھا دیئے زمین پر اس کا جوڑی دار نہیں ملنے کا۔ عجب شہر ہے۔ ہر بات الٹی۔"

کراچی کے بارے میں یوسفی کا مندرجہ ذیل تبصرہ اہل کراچی کی عادات پر روشنی ڈالتا ہے "اس قسم کی آب و ہوا میں چائے اور سٹے کے بغیر تندرستی قائم نہیں رہ سکتی۔"

رشید احمد صدیقی نے چارپائی پر ایک پرلطف مضمون لکھا ہے جس کا ذکر ہم کرچکے ہیں۔ اس میں ان کا رویہ چارپائی اور اس کے حوالے سے مشرقی تمدن کے معاملے میں بے نیازانہ زیادہ اور تمسخرانہ کم ہے۔ جبکہ یوسفی نے "چارپائی اور کلچر" کے عنوان سے جو مزاحیہ مضمون قلم بند کیا ہے۔ اس میں ایک تنقیدی سوچ، کسی قدر استہزا اور بذلہ سنجی ملتی ہے۔ جیسے "چارپائی ایک ایسی خود کفیل

تہذیب کی آخری نشانی ہے جو تے تقاضوں اور ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نت نئی چیزیں ایجاد کرنے کے قائل نہ تھی بلکہ ایسے نازک مواقع پر پرانی چیزوں میں نئی خوبیاں دریافت کر کے مسکرادیتی تھی ۔

اور " مریض جب کھاٹ سے لگ جائے تو تیمار دار موخر الذکر کے وسط میں بڑا سا سوراخ کر کے اول الذکر کی مشکل آسان کر دیتے ہیں ۔ "

اردو کے علاقائی تلفظ اور مقامی رنگ کو بھی دیگر مزاح نگاروں کی طرح یوسفی نے موضوع بنایا ہے ۔ یہ مزاح نگاروں کا ابتداء ہی سے من پسند موضوع رہا ہے ۔ یوسفی نے کراچی کی گجراتی آمیز اردو کا روپ دکھایا ہے جو بالعموم میمن ، بوہرے اور پارسی یا گجراتی بولنے والے اسماعیلی بولتے ہیں ۔ "ادھر تو چوبیس کلاک بابا کار مچیلا ہے ۔ اجن جو نا مٹا ختم نہیں ہوا کہ نوا پھڈا ہو گیا ۔ بینک کا بھٹہ بیٹھ گیا ۔ جب تلک سالا لوگ ہمارا ایگار نہیں بڑھائیں گا ، ۱۰ اکھا دن ڈیلی اسی موافق لفڑا رہیں گا ۔ اسی طرح انھوں نے مدراسی اردو ، دکنی اردو اور یوپی کے دیہات کی اردو کے نمونے بھی پیش کیے ہیں ۔ اور اردو میں سنسکرت کے الفاظ ٹھونسے جانے پر بھی رائے دی ہے ۔ بھارت میں اردو کی حالت پر لکھتے ہیں ۔ " سنا ہے کئی اردو ادیبوں کو پدم شری اور پدم بھوشن کے خطاب مل چکے ہیں ۔ میں نے گنیوں سے پدم اور بھوشن کے معنی پوچھے تو جواب میں انھوں نے وہ رقم بتائی جو خطاب کے ساتھ ملتی ہے ۔ اگر چہ یوسفی کے ہاں سیاسی اور سماجی معاملات پر اس قسم کی رائے زنی نہیں ملتی جیسی بعض دیگر مزاح نگاروں کے ہاں ، لیکن اپنے اسلوب ، زبان ، ذہانت اور بذلہ سنجی کی بدولت یوسفی اردو مزاح میں زندہ جاوید رہیں گے ۔ ☆

دے کے خط (مراسلے)

محترم ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب
تسلیم و نیاز

حیدرآباد کا قیام اس قدر مختصر رہا کہ آپ سے فون پر گفت و شنید کے علاوہ میری بدقسمتی کہ نیاز حاصل نہ کر سکی۔ اب کی بار انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔ ہم نے برسوں کا تار توڑ تو دیا ہے۔ ایک دو بار بیسچلر کوارٹرز پر سے گزر بھی ہوا۔ مگر آپ کی نشست کا وقت نہیں تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ شام میں آپ اپنے آفس پر بیٹھتے ہیں۔ حیدرآباد کو برسوں بعد دیکھا تو سکون ملا۔ آدمی چاہے کہیں جاکر بس جائے اسے وطن کی محبت مقناطیس بن کر کھینچتی ہے۔ آپ کا ذکر خیر یہاں ضرور ہوتا رہتا ہے۔

شگوفہ کے لیے آپ کی کاوش ان تھک جانفشانی زبان اردو کی ایک اہم صنف طنز و مزاح کو زندہ رکھے ہوتے ہے۔

بہت ساری دعاؤں کے ساتھ خوشیہ غیاث الدین۔ شکاگو

مکرمی ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب

آداب

مئی کا "شگوفہ" نظر نواز ہوا۔ عنایت کا شکریہ۔ اگر رعایت لفظی سے کام لیا جائے تو یہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شگوفہ نے دل باغ باغ کر دیا۔ گوشہ ڈاکٹر حامد حسین بہت اشتیاق سے پڑھا۔ محترمہ حنیفہ فرحت صاحبہ کا لکھا ہوا خاکہ گوشے کی جان ہے۔ لیکن دراصل مرحوم ڈاکٹر صاحب کی قد آور اور پہلو دار شخصیت کا نیز ان کے عظیم الشان ادبی کارناموں کا تقاضہ تو یہ ہے کہ مرحوم پر ایک مکمل ضخیم نمبر نکالا جاتا۔ تاہم آپ ، کنہیں وجوہات " سے صرف مختصر گوشہ ہی شائع کر سکے تو دل کو سمجھانا پڑا۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ خدا کرے "شگوفہ" میں ڈاکٹر حامد حسین مرحوم پر آپ کا دیا ہوا گوشہ دیگر رسائل کے لیے محرک اور مشعل راہ بنے۔

نعیم صبا۔ بھوپال

محترم جناب سید مصطفیٰ کمال صاحب
اسلام علیکم

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ شگوفہ ماشا اللہ بہتر سے بہتر ہوتا جارہا ہے۔ کوشش کروں گا تازہ مضمون پہنچاتا رہوں۔

جہاں قدر چغتائی، بھوپال

پھر ملیں گے اگر خدا لایا ..... اداریہ

شگوفہ کی زندگی کم و بیش دور یوسفی پر محیط ہے۔! یہ کیسے ممکن تھا کہ یہ رسالہ مشتاق احمد یوسفی کے مضامین سے استفادہ کیے بغیر زندہ رہتا؟ ۔ نومبر ۱۹۶۸ء میں ڈیڑھ ماہی رسالہ کے طور پر شگوفہ جاری ہوا۔ ان دنوں مشتاق احمد یوسفی کے مضامین کا پہلا مجموعہ شائع ہو چکا تھا۔ اس مجموعہ کے تمام مضامین، "مال مسروقہ" کے عنوان سے وقتاً فوقتاً شگوفہ میں شائع ہوتے رہے۔ یہی سلوک "خاکم بدہن" کے ساتھ روا رکھا گیا۔ ادبی سرقہ کا یہ سلسلہ تادم تحریر جاری ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی تمام تحریریں شگوفہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ بارہا یہ خیال ہوا کہ اس بے مثال مزاح نگار کا ایک خصوصی نمبر شائع کیا جائے۔ دو ایک بار منصوبے بھی بنائے گئے۔ لیکن ان کے شایان شان خصوصی نمبر کی اشاعت میں ہماری بے بضاعتی مانع رہی۔ قارئین شگوفہ کے اصرار پر فی الوقت مناسب یہ سمجھا گیا کہ کم از کم ایک شمارہ مشتاق احمد یوسفی کے لیے وقف کیا جائے۔ اس شمارے میں یوسفی کے مضامین کے مختصر انتخاب کے علاوہ ان پر دو خاکے اور تنقیدی مضمون شامل کیا گیا ہے۔ ہمیں سخت احساس ہے کہ اپنے دور کے مقبول ترین ادیب اور قد آور طنز و مزاح نگار کے فکر و فن کا خاطر خواہ جائزہ نہیں لیا گیا۔

قارئین شگوفہ اس خاص شمارہ کی تحریروں سے یقیناً لطف اندوز ہوں گے۔ ان میں قند مکرر کا بھی لطف ہے۔ ●

●☆●